سورۃ نمبر	سورہ الملک	بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات

﴿تَبٰرَکَ الَّذِیۡ بِیَدِہِ الۡمُلۡکُ﴾

(منزہ و برتر ہے وہ جس کے قبضہ میں (سب جہانوں کی) بادشاہی ہے) تمام امور کا تصرف اسی کے قبضہ قدرت میں ہے (تبارك فعل ماضی ہے اور اس سے مضارع، اور اسم فاعل وغیرہ کے صیغہ نہیں آتے کیونکہ تبارك سے صرف فعل ماضی آتا ہے اور یہ صرف اللہ تعالی کے ساتھ خاص ہے

اس کے مادہ اشتقاق کے بارے میں دو قول ہیں

1: یہ بِرْکَۃٌ سے مشتق ہے جس کا معنی ہے تالاب۔ اور یہ زیادتی و کثرت پر دلالت کرتا ہے

2: یہ بَرَکَ یَبْرُکُ سے مشتق ہے جس کس معنی ہے اونٹ کا بیٹھنا/ مقیم ہونا/ اس وقت اس کا معنی ہوگا لزوم/ ثبوت/ دوام کیونکہ جب اُونٹ بیٹھتا ہے تو پھر جلدی کھڑا نہیں ہوتا اس لیے اس کے بیٹھنے میں ثبوت اور دوام ہوتا ہے)

(سوال) سوال: جواب:

''الید'' کا اطلاق تو وضعی طور پر انسانی جسم کے ایک جزء پر کیا جاتا ہے تو اس ''ید'' کی نسبت پروردگار عالم کی طرف کرنا کس اعتبار سے ہے؟

(جواب) سوال: جواب:

''الید'' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہو رہا ہے بلکہ اپنے مجازی معنی میں مستعمل ہے ''الید'' یہاں قبضہ قدرت اور استیلاء کے معنی میں ہے) (الملك : الملك پر جو الف لام ہے وہ استغراقی ہے معنی ہوگا تمام کے تمام امور کا تصور) (تبارك سے بتایا کہ تمام موجودات اس کے قبضہ قدرت میں ہیں۔ اس جملہ سے اس امر کی تصریح فرمادی کہ جو ممکنات ابھی موجود نہیں وہ بھی اس کے قبضہ قدرت میں ہیں)

﴿وَهُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ﴾

(اور وہ ہر چیز پر پوری طرح قادر ہے) ہر وہ چیز جسے چاہا گیا ہو (وہ) اس پر قادر ہے (شیء یہ مصدر ہے یہ بمعنی فاعل اور مفعول دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے جب بمعنی فاعل ہوگا تو ترجمہ ہوگا ہر وہ جو چاہنے والا ہے اور بمعنی مفعول ہو تو ترجمہ ہوگا ہر وہ جسے چاہا گیا ہے۔ یہاں بمعنی مفعول مراد ہے)

﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ﴾

(جس نے پیدا کیا موت اور زندگی کو) جس نے زندگی اور موت کو مقدر کیا یا جس نے زندگی کو وجود بخشا اور موت کو اس کی تقدیر کے مطابق زائل کیا۔

سوال: جواب: (سوال)

پہلے زندگی آتی ہے پھر موت، تو یہاں موت کو مقدم کیوں کیا؟

(جواب) سوال: جواب:

اور اللہ نے اپنے قول ''و کنتم امواتا فاحیاکم'' کی وجہ سے موت کو مقدم کیا یا اس لیے مقدم کیا کہ موت (زندگی کی نسبت) حسن عمل کی طرف زیادہ دعوت دینے والی ہے

﴿لِیَبۡلُوَکُمۡ﴾

(تاکہ وہ تمہیں آزمائے) تاکہ مکلّف بنا کر تمہارے ساتھ ممتحن جیسا معاملہ فرمائے اے مکلفو! (مکلفین سے مراد جن و انس ہیں) (''ادعی'' اسم تفضیل کا صیغہ ہے جو کہ ''الدعا'' سے مشتق ہے)

(سوال) سوال: جواب:

''بلی یبلو'' کا معنی ہوتا ہے امتحان لینا/ آزمانا اور امتحان تو وہ لیتا ہے جو معاملہ سے بے خبر ہو جبکہ اللہ تعالی تو ''علیم بصیر'' سب کچھ جاننے والا ہے ؟

(جواب)سوال:جواب:

''فعل ِ بلا '' یہاں اپنے حقیقی معنی میں استعمال نہیں ہو رہا ہے بلکہ اپنے مجازی معنی میں مستعمل ہے(مکلّف بنانے سے مراد: اوامر نواہی یعنی نماز، روزہ ،حج، زکوۃ وغیرہ ہیں)

﴿اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً﴾

(کہ تم میں سے عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے)وہ عمل جو صحیح ہو اور خالص ترین ہو اور حدیثِ مرفوع میں '' احسن عقلا ''آیا ہے یعنی تم میں سے عقل کے اعتبار سے کون اچھا ہے اور اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ اشیاء سے کون بچنے والا ہے اور اس کی اطاعت میں کون جلدی کرنے والا ہے

اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً کا جملہ ترکیب کے اعتبار سے فعلِ بلوی کے دوسرے مفعول کے محل کی جگہ واقع ہو رہا ہے جو کہ '' علم '' کے معنی کو متضمن ہے

(سوال)سوال:جواب:

دو مفعول تو صرف افعال قلوب کے ہوتے ہیں تو ''بلا یبلو '' کا دوسرا مفعول کیسے ممکن ہے؟

(جواب)سوال:جواب:

ہر اس فعل کے دو مفعول ہو سکتے ہیں جو علم کے معنی کو متضمن ہو تو پس یہاں ''بلی یبلو '' کا فعل علم کے معنی کو متضمن ہے اس لیے اس کے دو مفعول ہیں پہلا مفعول ''کم ''ضمیر اور دوسرا مفعول '' اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلا '' ، مضاف، کم ضمیر مضاف الیہ، مضاف، مضاف الیہ ملکر مبتدا اور '' اَحْسَنُ عَمَلا '' شبہ جملہ ہو کر مبتدا کی خبر، مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ ہو کر مفعول بہ ثانی ہو گا)

اور یہ تعلیق کے باب میں سے نہیں ہے کیونکہ جملہ کا خبر واقع ہونا تعلیق میں مخل ہے(یعنی تعلیق کو فاسد کر رہا ہے) پس فعل کو معلق نہیں کیا جائے گا بخلاف اس کے کہ جب یہ دونوں مفعولوں کی جگہ واقع ہو

(بلوی :'' علم '' کے معنی کو متضمن ہے اور '' علم '' افعال قلوب میں سے ہے جو کہ مبتدا اور خبر پر داخل ہو کر بوجہ مفعول بہ مبتدا، خبر کو نصب دیتے ہیں مثلا رَاَیْتُ الزاھدَ متبسماً اس مثال میں الزاھدَ اور متبسما مفعول بہ ہونے کے اعتبار سے منصوب ہیں حالانکہ حقیقتا یہ مبتدا اور خبر ہیں پھر ان کے استعمال کی تین صورتیں ہے 1: اعمال 2: تعلیق 3: الغا　تفصیل کے لیے تسہیل النحو[صفحہ نمبر 74

﴿ وَھُوَ الْعَزِیْزُ﴾

(اور وہی دائمی عزت والا) ایسا غالب کہ برا کام کرنے والا اسے عاجز نہیں کر سکتا

﴿ الْغَفُوْرُ﴾

(بہت بخشنے والا ہے) لوگوں میں سے جو توبہ کرنے والا ہے اس کو معاف فرمانے والا ہے

﴿الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا﴾

(جس نے بنائے ہیں سات آسمان اُوپر نیچے)مطابقہ　امام بیضاوی اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے جادل یجادل مجادلۃ و جدالا بعضھا فوق بعض ایک دوسرے کے اوپر تہ درتہ۔طابقت النعل کا مصدر ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ چمڑے کو چمڑے کے اوپر رکھ کر سلائی کرتے ہیں۔اور اس کے ساتھ '' سبع سموات ''کی صفت بیان کی گئی ہے

(سوال)سوال:جواب:

مصدر تو صفت واقع نہیں ہوتا تو پھر یہاں مصدر کا صفت بننا کیسے ممکن ہے؟

(جواب)سوال:جواب:

مصدر کو مبالغہ کے اظہار لیے بطور صفت بیان کیا ہے) یا یہ طوبقت طباقا ہے یعنی اس سے پہلے فعل محذوف ہے اور طباقا مفعول مطلق ہے یا اس سے اس جانب ہے کہ یہ صفت واقع ہو رہا ہے جس کی بناء پر اس سے پہلے ذات کا لفظ نکالا ہے کیونکہ یہ یہاں اسم جامد ہے اور اسم جامد صفت واقع نہیں ہوتا بلکہ اس سے پہلے مذکر کے لیے ذو اور مونث کے لیے ذی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو چونکہ ''سموات'' مؤنث ہے اس لیے ذات کا لفظ محذوف نکالا ہے یا طباقا طبق کی جمع ہے جیسے جبل کی جبال یا طبقة کی جمع ہے جیسے ''رحبہ'' کی جمع ''رحاب''

(''طباقا'' کے منصوب ہونے کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں 1: یا تو ''سبع'' کی صفت ہے 2: یا ''خلق'' کا مفعولِ ثانی ہے اور امام حمزہ بن الذیات الکوفی اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے تفاوت کو تفوت سے پڑا ہے باب تَفَعُّل سے پڑھا ہے باب تفاعل سے ہو یا تَفَعُّل سے دونوں کا معنی ایک ہی ہے جیسے التعاهد اور التعهد ان دونوں کا ایک ہی معنی ہے نگہداشت کرنا

تفاوت کا معنی یہ ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز سے مختلف ہونا اور دو چیزوں کے درمیان مناسبت کا نہ پایا جانا۔ پس دو متفاوت چیزوں میں سے ایک چیز کا بعض حصہ دوسری چیز میں نہیں پایا جاتا اور یہ جملہ ''سبع'' کی صفت ثانیہ ہے پہلی صفت ''طباقا'' ہے

(سوال) سوال: جواب:

جب جملہ صفت واقع ہو رہا ہو تو اس میں ایک ضمیر کا ہونا ضروری ہوتا ہے جو ماقبل کی طرف لوٹے جبکہ یہاں تو کوئی ضمیر مذکور ہی نہیں ہے؟

(جواب) سوال: جواب:

"خلق الرحمن" کو ضمیر جگہ رکھنا تعظیم اور اس چیز کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ اللہ تعالی از روئے رحمت اور فضیلت کے اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ آسمانوں کی مثل چیزیں پیدا کرتا ہے اور ان چیزوں کے تخلیق کرنے میں بہت سی ایسی عظیم نعمتیں ہیں جن کو شمار نہیں کیا جا سکتا اور یہ مبارکہ خطاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا ہر مخاطب کو ہے۔ اور اللہ تعالی کا فرمان

﴿ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ﴾

(تمہیں نظر نہیں آئے گا (خداوندِ) رحمٰن کی آفرینش میں کوئی خلل) اللہ تعالی کا یہ قول فارجع البصر ......تسبب کے معنی پر ما تری کے متعلق ہے یعنی متعلق سے مراد یہ ہے کہ اس قول کا تعلق، مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ سے معنوی طور پر ہے نہ کہ جار مجرور والا متعلق، مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ یہ سبب ہے اور فارجع البصر هل ترى من فطور یہ مسبب ہے) (ترکیب: مضاف، الیہ ملکر مبتدا ہے اور فارجع البصر ......اس کی خبر ہے) پس تحقیق کہ آپ نے کئی بار آسمان کی طرف دیکھا پس آپ اس کی طرف ایک مرتبہ دوبارہ غور و فکر کریں تا کہ آپ معاینہ کرلیں اس چیز کا جس کے ساتھ آپ کو آسمانوں کے باہم متناسب اور مستقیم ہونے کی اور ان تمام چیزوں کے جامع ہونے کی جو اس کے لیے مناسب ہے، خبر دی گئی ہے اور ''فطور'' کا معنی پھٹن / شگاف / رخنہ ہے۔ اس سے مراد کجی / ٹیڑھا پن ہے۔ یہ عربیوں کے قول فَطَرَہ سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی چیز / شئے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے

(سوال) سوال: جواب:

حرف جارہ تو اسماء پر داخل ہوتا ہے جبکہ یہاں ''مِن'' کو امام بیضاوی نے فعل پر داخل کیا ہے؟

(جواب) سوال: جواب:

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ حروف جار اسماء پر داخل ہوتے ہیں یہ امام بیضاوی کا طریقہ کار ہے کہ جب انہوں نے کسی قول / ضرب المثل وغیرہ سے کوئی معنی اخذ کرنا ہو تو وہ اس سے پہلے ''مِن'' کو داخل کرتے ہیں اور اصل عبارت یوں ہوتی ہے ''من قولہ'' وغیرہ

﴿ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ ﴾

(پھر بار بار نگاہ ڈالو) خلل کی تلاش میں اپنی آنکھ کو دوبارہ لوٹائیں اور تثنیہ سے مراد تکریر اور تکثیر

(یعنی تثنیہ سے مراد دو دفعہ دیکھنا مراد نہیں ہے کیونکہ دو دفعہ دیکھنے سے آنکھ نہیں تھکتی بلکہ بار بار دیکھنا مراد ہے) جیسے کہ ''لبیک'' اور ''سعدیک'' (کیونکہ حجاج کرام صرف دو دفعہ ہی نہیں کہتے بلکہ بار بار اس کا ورد کرتے ہیں)

(''لبیک'' یہ ''الب'' سے ماخوذ ہے جس کا معنی ہے مقیم ہونا اور ''سعدیک''، اَسعد سے نکلا ہے اور اس کا ظاہری معنی تو مدد کرنا ہوتا ہے لیکن یہاں عطا کرنا کے معنی میں ہے) اس لیے اللہ تعالیٰ نے امر ﴿ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ﴾ کا جواب اپنے فرمان

﴿يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا﴾

(پھر بار بار نگاہ ڈالو لوٹ آئے گی تیری طرف (تیری) نگاہ ناکام ہوکر) سے دیا ہے

(خاسئا کا معنی بتا رہے ہیں) وہ مطلوب کو حاصل کرنے میں انتہائی دور ہوگئی گویا کہ اسے حقارت کے ساتھ دھتکار دیا گیا ہے

﴿وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾

(درآنحالانکہ وہ تھکی ماندی ہوگئی) بار بار لوٹانے کی وجہ سے اور لوٹنے کی طوالت کی وجہ سے تھکی ہوئی ہوگئی

(طول المعاودة: لوٹنے کا طویل ہونا۔ کثرة المراجعت: بار بار لوٹنے کی وجہ سے)

﴿وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا﴾

(اور بے شک ہم نے قریبی آسمان کو آراستہ کر دیا ہے) زمین کے قریبی ترین آسمان کو (الدنیا: ادنیٰ کی مونث ہے جس کا معنی ہے قریب تر، یہ السماء کی صفت ہے۔ وہ آسمان جو زمین کے قریب تر ہے یعنی آسمان اول)

﴿بِمَصَابِيْحَ﴾

(چراغوں سے) ایسے ستاروں کے ساتھ جو رات کو چراغوں کی طرح روشن ہوتے ہیں (مصابیح کا لفظ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہو رہا ہے، یہاں استعارہ تصریحہ ہے۔ ''اضائة السرج'' یہ ''مضيئة'' کا مفعول مطلق ہے جو کہ اس کی نوع بیان کر رہا ہے) (مصابیح: مصباح کی جمع ہے)

(سوال) سوال: جواب:

فلاسفر کا کہنا ہے کہ تمام ستارے ایک ہی آسمان کے اوپر مرکوز نہیں بلکہ مختلف آسمانوں پر مرکوز ہیں جبکہ اس آیت کریمہ میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ نے قریبی ترین آسمان کو مزین کیا ہے۔ ان کے درمیان موافقت کیسے ہیں؟

سوال: جواب:

(جواب)

اول تو ہم لوگ فلاسفر حضرات کی اصطلاحات کو مانتے نہیں ہیں بالفرض اگر تسلیم کر بھی لے تو اس کا جواب یہ ہے کہ آسمان دنیا کی زینت روشنی کی وجہ سے ہے ستارہ اگرچہ جس بھی آسمان پر مرکوز ہے لیکن آسمان کے شفاف ہونے کی وجہ سے وہ روشنی سب آسمانوں پر موجود ہے

یہ آسمانِ دنیا کو ستاروں متعین/مزین کیا جانا اس بات کے مانع نہیں کہ کہ بعض ستارے اوپر والے آسمان میں مرکوز ہیں کیونکہ ستاروں کا آسمانِ دنیا میں ظاہر کرنا اس کی تزین کے لیے کافی ہے اور ''مصابیح'' کو نکرہ ذکر کرنا تعظیم کے لیے ہے

﴿وَجَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّيٰطِيْنِ﴾

(اور بنا دیا ہے انھیں شیاطین کو مار بھگانے کا ذریعہ) اور ہم نے ان کے لیے ایک دوسرا فائدہ بھی بنایا ہے (پہلا فائدہ: آسمان کو مزین کیا) یہ مسبب شہاب ثاقب کے ٹوٹنے کے ساتھ آپ کے دشمنوں کو رجم (مارنا) ہے

(مسبب: یعنی وہ ستارے خود نہیں ٹوٹتے بلکہ ان سے خالص آگ کا دہکتا انگارہ نکلتا ہے جس کے ساتھ رجم کیا جاتا ہے

یتقض ینقض: ٹوٹنا۔شہاب کی جمع شُھب آتی ہے اور کہا گیا ہے کہ وَجَعَلْنٰھَا رُجُوْمًا کا معنی یہ کہ ہم نے ان ستاروں کو شیاطین انس کو رجم کرنے اور گمان کرنے کا ذریعہ بنا دیا ہے اور وہ نجومی ہیں

(شیاطین انس سے مراد نجومی ہیں: نجومی وہ لوگ ہوتے ہیں جو ستاروں کی حرکات وسکنات کو دیکھ کر لوگوں کے مستقبل کے متعلق پشین گوئیاں کرتے ہیں اور لوگوں سے رقم بٹورتے ہیں نعوذ باللہ من المنجمون) رجوم "رجم کی جمع ہے کے فتحہ کے ساتھ اور جو کہ مصدر ہے

(سوال) سوال: جواب:

مصدر کی تو جمع نہیں لائی جاتی کیونکہ مصدر جنس پر دلالت کرتا ہے اور اس میں قلت وکثرت کا معنی موجود ہوتا ہے پھر اس کی جمع لانے کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اس مصدر کے ساتھ نام دیا گیا ہے اس چیز کو جس کے ساتھ مارا جاتا ہے اور اسی استعمال کے باعث اس کی جمع لائے گئی ہے ورنہ مصدر کی جمع نہیں بنائی جاتی (بعض اوقات مصدر کو آلہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے)

﴿ وَاَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيْرِ ﴾

(اور ہم نے تیار کر رکھا ہے ان کے لیے دہکتی آگ کا عذاب) دنیا میں شہاب کے ساتھ جلائے جانے کے بعد آخرت میں

﴿ وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ ﴾

(اور جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کا) شیطانوں اور ان کے علاوہ (انسانوں میں سے)

﴿ عَذَابُ جَهَنَّمَ ﴾

(ان کے لیے عذاب جہنم ہے) اور "للذین" کا عطف "لھم" پر اور "عذاب جهنم کا عطف "عذاب السعیر" پر کرتے ہوئے عذاب جہنم کو نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے

﴿ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا سَمِعُوْا لَهَا شَهِيْقًا ﴾

(اور جہنم بڑی بُری لوٹنے کی جگہ ہے۔جب وہ اس میں جھونکے جائیں گے تو اس کی زوردار گرج سنیں گئے) ایسی آواز جو گدھے کی آواز کے مشابہ ہوتی ہے (گدھے کی ابتدائی آواز کو "شھیق" اور آخری آواز کو "زفیر" کہتے ہیں) (سخت، قبیح اور ناگوار آواز کو بھی شہیق کہتے ہے۔)

﴿ وَّهِيَ تَفُوْرُ ﴾

(اور وہ جوش مار رہی ہوگئ) جہنمیوں کے ساتھ اس طرح جوش مار رہی ہوگئی جس طرح ہانڈی ان اشیاء کے ساتھ جوش مار رہی ہوتی ہے جو اس میں موجود ہوتی ہیں (تتفرق: پھٹ جانا/ٹکڑے ٹکڑے ہوجانا) (تفور تغلی کغلیان المرجل ہانڈی کی طرح اُبلنا)

﴿ تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ﴾

((ایسا معلوم ہوتو ہے) گویا مارے غضب کے پھٹا چاہتی ہے) جہنمیوں کے اوپر از روئے غضب ان کے اوپر پھٹ جائے

سوال: جواب: (سوال)

گرجدار آواز، جوش مارنا، اور غضب ناک ہونا یہ تمام صفات ایک ایسی ذات میں پائی جاتی ہیں جو احساسات کی حاصل ہو جبکہ جہنم کوئی حسی چیز تو نہیں تو پھر ان تمام صفات کو جہنم کی طرف منسوب کرنا کیسے ممکن ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اور یہ جہنمیوں پر جہنم کے مشتعل ہونے کی شدت کو بیان کرنے کے لیے ایک تشبیہ ہے

(یہاں استعارہ تصریحیہ ہے جہنم کی شدت، غیض وغضب کو مغلوب الغضب وحشی جانور کے ساتھ تشبیہ دی استعارہ کے متعلق تمام مباحث البلاغة

الواعظہ میں مرکوز ہیں اس بناء پر استعارہ کا فہم دوہرائی میں حاصل ہوگا) اوراس سے زبانیہ (جہنم کے فرشتوں) کا غصہ مراد لینا بھی جائز ہے (تمیز ای تنشق ۔ پھٹ جانا، پارہ پارہ ہونا)

﴿ كُلَّمَآ اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ ﴾

(جب بھی اس میں کوئی جھتا جھونکا جائے گا) کافروں کی جماعت کا کوئی گروہ (کفرہ: '' کافر'' کی جمع ہے جیسے ''خازن'' کی جمع ''خزنۃ'' اور ''طالب'' کی جمع ''طلبۃ'')

﴿ سَاَلَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ يَاْتِكُمْ نَذِيْرٌ ﴾

(تو ان سے دوزخ کے محافظ فرشتے پُوچھیں گے کیا تمہارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا تھا) جو تمہیں اس عذاب سے ڈراتا/خوف دلاتا

سوال: جواب: (سوال)

کیا فرشتوں کو معلوم نہیں تھا کہ اللہ نے ان کی ہدایت کے لیے انبیاء کو مبعوث کیا تھا؟

سوال: جواب: (جواب)

(فرشتوں کو ان باتوں کا علم تھا لیکن یہ سوال کرنا دراصل ان کو جھڑکنا اور حجت کے ساتھ ان کا منہ بند کرنا ہے)

﴿ قَالُوْا بَلٰى قَدْ جَآءَنَا نَذِيْرٌ ﴿ فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ﴾

(وہ کہیں گے کیوں نہیں بے شک ہمارے پاس ڈرانیوالا آیا تھا پس ہم نے اسے جھٹلایا اور ہم نے صاف صاف کہہ دیا کہ اللہ تعالی نے تو کوئی چیز نہیں اتاری۔ تم لوگ کھلی گمراہی میں مبتلا ہو) یعنی ہم نے رسولوں کی تکذیب کی اور ہم ان کی تکذیب میں اتنے سرکش ہو گئے کہ ہم نے (اصلا) سرے سے ہی ان کے نازل ہونے کی نفی کردی اور ہم نے ان کی طرف گمراہی کی نسبت کرنے میں بہت زیادہ مبالغہ کیا

سوال: جواب: (سوال)

باللہ تعالی نے ''نذیر'' ذکر کیا جبکہ '' ان انتم '' میں خطاب جمع کو کیا جارہا ہے اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک جگہ مفرد اور ایک جگہ جمع ؟

سوال: جواب: (جواب)

''نذیر'' یا تو جمع کے معنی میں کیونکہ یہ فعیل کے وزن پر ہے فعیل کے وزن میں مفرد اور جمع دونوں برابر ہوتے ہیں یا یہ ایسا مصدر ہے جس کا مضاف مقدر ہے یعنی تقدیر کلام یہ ہے اہل انذار'' کا جمع کے معنی میں ہوتا ہے بطور مبالغہ مصدر کے لیے صفت لگائی گئی ہے یا ''نذیر'' واحد کے معنی میں ہے اور خطاب ایک پیغمبر کو اور اس کی مثل دوسرے پیغمبروں کو ہے تغلیب کے طریقہ پر یعنی حاضر کو غائب پر غلبہ دیا (اس صورت میں واحد کا عطف جمع پر ہے یعنی النذیر اما بمعنی الواحد) یا ایک کو جھٹلانا سب کو جھٹلانے کے قائم مقام ہے (یا نذیر واحد کے معنی میں ہے) کہ معنی یہ ہے کہ کے گروہ کہیں گے کہ تحقیق ہم میں سے ہر ایک کی طرف ایک رسول آیا پس ہم نے ان کو جھٹلایا اور ان گمراہ جانا (یعنی ہم نے ان رسولوں کی طرف گمراہی کی نسبت کی)

(ان تمام صورتوں میں اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ کا قول کفار کی طرف سے رسولوں کو ہوگا) اور یہ بھی جائز ہے کہ قول زبانیہ کے اس کلام سے ہو جو وہ کفار سے کہیں گے قول کے ارادہ پر (یعنی قول مقدر ہوگا اور اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ مقولہ ہوا اور تقدیر کلام یوں ہوگا ''قالتِ الخزنۃ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ'') اور ضلال سے مراد ہو گمراہی ہے جس پر وہ دنیا میں قائم تھے یا ضلال سے مراد وہ سزا ہے جس میں وہ مبتلا ہونگے)

﴿ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ ﴾

(وہ کہیں گے کاش! ہم نصیحت کو سنتے) رسولوں کے کلام کو (کلام الرسل سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''نسمع'' فعل متعدی ہے اور اسکا مفعول بہ محذوف ہے) پس ہم اس کلام کو بغیر کسی بحث و تمحیص کے مکمل طور پر قبول کر لیتے اس سچائی پر اعتماد کرتے ہوئے جو معجزات کی وجہ سے ظاہر ہوئی تھی

(فَنَقْبَلُهُ جملةً مِن غيرِ بَحْثٍ اِعتماداً مَا لَاحَ من......)

(جملہ کے دو معنی ہوتے ہیں 1: مجموعہ 2: اجمال
یہاں جملہ مجموعہ کے معنی میں مستعمل ہے)

﴿اَوْ نَعْقِلُ﴾

(اور سمجھتے) ہم اہل بصیرت کی طرح اس کے حکم اور معانی میں غور وفکر کرتے

سوال: یہاں سمع عقل کو پر مقدم کیوں کیا؟

جواب: سمع کو عقل پر مقدم کیا تاکہ دلائل سمعیہ کی اولیت کا احساس ہو جائے اور معلوم ہو جائے کہ عقل بغیر دلائل سمعیہ کی تائید کے قابل اعتماد نہیں۔ نیز اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ عقل سلیم، نقل صحیح کے مخالف نہیں ہوا کرتی بلکہ ان میں یکسانیت ہوا کرتی ہے

﴿مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾

(تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے) یعنی ہمارا شمار دوزخیوں میں نہ ہوتا اور ہم ان کے مجموعہ سے نہ ہوتے

﴿فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ﴾

((پس اس روز) اپنے گناہوں کا اعتراف کریں گے) جس وقت وہ (اعتراف کرنا) انہیں کوئی نفع نہیں دئے گا (کیونکہ وہ دار مجاز ہوگا نہ کہ دار عمل اس لیے جرم کا اعتراف کرنا اور توبہ کرنا انہیں کوئی نفع نہیں دئے گا) (اعتراف: کسی چیز کو پہچاننے کے بعد زبان سے اس کا قرار کرنا اعتراف کہلاتا ہے)

سوال: انہوں نے بے شمار گناہ کیے تھے پھر "ذنب" یعنی مفرد کیوں ذکر کیا؟

جواب: "الذنب" کی جمع نہیں لائی جاتی کیونکہ یہ مصدر ہے یعنی مصدر میں قلت وکثرت کا معنی پایا پایا جاتا ہے اور اس الذنب سے مراد کفر ہے (کفر یعنی رب کا انکار کرنا ایک ایسا قبیح گناہ ہے جو سب گناہوں پر بھاری ہے)

﴿فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴾

(تو پھٹکار ہو اہل جہنم پر) پس اللہ تعالی نے انہیں پھٹکارا یعنی ان کو اپنی رحمت وعنایت سے دور کر دیا اور راندہ درگاہ بنا دیا (یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے)

سوال: "سحقا" ثلاثی کا مصدر ہے جبکہ علامہ بیضاوی نے مزید فیہ کا مصدر بنایا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: یہ غیر ثلاثی کا ہی مصدر ہے لیکن بعض اوقات مصدر سے حروف زائدہ کو حذف کر دیا جاتا ہے (حروف زائدہ کا مجموعہ "**سالتمونیها**" ہے) تعلیل ایجاز، مبالغہ اور تعلیل کے لیے ہے۔ اما م علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے (سحُقا) ثقل کے ساتھ پڑھا ہے

سوال: اس جملہ میں تغلیب کیا ہے؟

جواب: اللہ تعالی نے پہلے شیاطین کا ذکر کیا اور فرمایا اعتدنا لھم عذاب السعیر پھر کفار کا ذکر کیا اور فرمایا وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ چاہیے تو یہ تھا کہ یہاں بھی دونوں یعنی دونوں کا ذکر کیا جاتا ہے اور کلام یوں ہوتا فسحقا لھم و لاصحاب السعیر لیکن اصحاب السعیر کو "لھم" پر غلبہ دیا اور اصحاب السعیر کو ذکر کر کے "لھم" کو ذکر نہیں کیا یہ غلبہ دینا تغلیب ہے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے تغلیب کے تین فائدہ ذکر کیے ہیں

1۔ ایجاز: اس کلام میں تغلیب سے ایجاز پیدا ہوا ہے یعنی کلام مختصر ہوا ہے اگر تغلیب نہ ہوتی تو کلام یوں ہوتا فسحقا لھم وللقائلین بلی

2۔ تعلیل جب مشتق پر کوئی حکم لگایا جائے تو اس کا ماخذ اشتقاق اس حکم کی علت ہوتا ہے مثلا فاکرموا اھدا العالم "اکرموا" حکم ہے اور "العالم" کا مادہ اشتقاق علم ہے (یعنی علم کی وجہ سے اس کی عزت کرو)/ تغلیب سے تعلیل اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ حکم جس وصف پر مرتب کیا جائے وہ وصف اس حکم کے لیے علت ہو جیسے الحمد للہ رب العالمین، اس کلام میں حمد کا حکم اللہ کے لیے اس وجہ سے ہیں کہ وہ رب العالمین

ہے اور یہ حمد کی علت ہے۔یہاں بھی سحقا[پھٹکار] کے حکم کو جس وصف پر مرتب کیا جارہا ہے وہ ان کا اصحاب السعیر ہونا ہے اور اس اعتبار سے تغلیب تعلیل کے لیے ہے

3۔مبالغہ: جب ایک حکم کو مجمل اور دوسرے کو مفصل ذکر کیا جائے تو وہاں مبالغہ ہوتا ہے جیسے'' الم نشرح '' یہ کلام مجمل ہے لیکن '' لك ''،مفصل ہے ۔یہاں مبالغہ بذریعہ تغلیب اس طرح ہے کہ اگر کلام یوں ہوتا فسحقا لھم و لاصحاب السعیر تو اس صورت میں ''واؤ' مغایرت پر دلالت کرتی اور معلوم ہو تا کہ شیاطین کے لیے الگ نوعیت کا عذاب ہے اور کفار کے لیے الگ نوعیت کا،یعنی دونوں کی بربادی میں یہ وہم پیدا ہوسکتا تھا کہ ایک کی شدت کم ہے اور ایک کی شدت زیادہ ہے تو دونوں ایک حکم یعنی اصحاب السعیر کے حکم میں داخل کرنے سے یہ مفہوم پیدا ہوا کہ دونوں کے لیے ایک ہے نوعیت کی پھٹکار ہے اور اس میں مبالغہ ہے مزید تفصیلات کے لیے روح المعانی جلد ششم سورہ الملک کا مطالعہ فرمائیں

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یَخۡشَوۡنَ رَبَّھُمۡ بِالۡغَیۡبِ﴾

(بے شک جولوگ اپنے رب سے بن دیکھے ڈرتے ہیں) وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں دراں حالانکہ وہ عذاب ان سے پوشیدہ ہے انہوں نے ابھی تک اس کا معاینہ نہیں کیا (بعدُ کا مطلب ہے ابھی تک۔اس کا مضاف الیہ محذوف ہے/ حتی الآن) یا وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں دراں حالانکہ وہ عذاب سے غائب ہیں یا لوگوں کی آنکھوں سے پوشیدہ ہیں (یعنی اپنی خلوتوں میں بھی اپنے رب سے اسی طرح ڈرتے ہیں جس طرح وہ جلوتوں میں ڈرتے ہیں) یا وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں اس چیز کے ساتھ جوان سے پوشیدہ ہے اور وہ ان کے دل ہیں۔(امام بیضاوی ترکیب کلام میں بالغیب کا محل بتارہے ہیں)

1۔پہلی صورت میں مفعول سے حال ہے یعنی '' ربھم '' ذوالحال،''غائبا '' حال لیکن اس صورت میں ''ربھم '' سے پہلے''عذاب'' کالفظ مقدر ماننا جائے گا کیونکہ رب غائب نہیں ہے بلکہ اس کا عذاب غائب ہے جس کا مشاہدہ وہ قبر میں کریں گے یا قیامت کے دن

2۔دوسری صورت میں فاعل سے حال واقع ہورہا ہے یعنی یَخۡشَوۡنَ میں ''واوجمع'' ذوالحال ہوگی اور ترجمہ یہ ہوگا کہ وہ اللہ کے عذاب سے ڈرتے ہیں دراں حالانکہ وہ عذاب سے غائب ہیں

﴿لھم مغفرۃ﴾

(ان کے لیے (اللہ کی) مغفرت)ان کے گناہوں کے لیے (بخشش ہے)

﴿وَّاَجۡرٌ کَبِیۡرٌ﴾

(اور اجر عظیم ہے)یَصۡغُرُ دونه لذائذُ الدنیا دنیا کی لذتیں حقیر ہوگئی (صغر یَصۡغُرُ: حقیر ہونا،چھوٹا ہونا۔''دون''کے اگرچہ بہت سے معنی ہیں لیکن یہاں ''سامنے'' کے معنی میں ہے)(علامہ پانی پتی ''کبیر '' کی تشریح کرتے ہیں''یصضر بالنسبة الیه کل ما یخطر بالبال من الذة'' یعنی دل میں جس لذت و سرور کا تصور کیا جا سکتا ہے وہ بھی اس کے اجر کے سامنے ہیچ ہو گئی)

﴿وَاَسِرُّوۡا قَوۡلَکُمۡ اَوِاجۡھَرُوۡا بِھٖ اِنَّهٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ﴾

(تم اپنی بات کہو آہستہ یا بلند آواز سے (اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا) بے شک وہ خوب جاننے والا ہے جو کچھ سینوں میں ہے۔(اے نادانوں!) کیا وہ نہیں جانتا)(بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا ہے۔وہ بڑا باریک بین،ہر چیز سے باخبر ہے) پوشیدہ باتوں کو جانتا ہے اس سے پہلے کہ کوئی انہیں ''سرا ''یا'' جھرا''،تعبیر کرئے

﴿اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ﴾

((اے نادانوں!) کیا وہ نہیں جانتا)(بندوں کے احوال کو) جس نے (انہیں) پیدا کیا ہے) کیا وہ پوشیدہ اور ظاہری باتوں کو نہیں جانتا جس نے اشیاء کو وجود بخشا ہے جس قدر اس کی حکمت نے ان کو مقدر کیا (اس صورت میں ''من خلق''، موصول ،صلہ مل کر یعلم '' کا فاعل ہے اور السر اور الجھر مفعول محذوف نکالے جائیں گئے)

﴿ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ﴾

(وہ بڑا باریک بین، ہر چیز سے باخبر ہے)اس کا علم ان تمام چیزوں تک پہنچنے والا ہے جو اس کی مخلوق میں ظاہر و پوشیدہ ہیں (اس صورت میں اشارہ اس جانب ہے کہ یعلم کا فاعل "من خلق "،نہیں ہیں بلکہ" یعلم " میں "هو "ضمیر مستتر فاعل ہے اور "من خلق " موصول ،صلہ مل کر مفعول بہ ہے)اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ کیا اللہ ان چیزوں کو نہیں جانتا جنہیں اس نے پیدا فرمایا ہے دراں حالانکہ وہ اس مقم و مرتبہ پر فائز ہے مشابہ: لوٹنے کی جگہ لیکن جدید عربی میں اس کا معنی ہے فائز ہونا اور اس حال هُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ کے ساتھ مقید کرنا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ " یعلم " کا مفعول خاص ہوتا کہ یہ تقید کا فائدہ دئے (خاص مفعول نکالنے سے خاص فائدہ حاصل ہورہا ہے یعنی وہ هو العالم كل شئى ہے)

روایت کیا گیا ہے مشرکین آپس میں کسی چیز کے متعلق گفتگو کرتے تو اللہ تعالیٰ ان اشیاء کی خبریں اپنے پیارے رسول ﷺ کو پہنچا دیتا تھا پس وہ کفار کہتے اپنی باتوں کو پست کرو کہیں محمد ﷺ کا پروردگار نہ سن لے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی جہالت پر ان کو آگاہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ ہے

﴿هُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا ﴾

(وہی تو ہے جس نے نرم کر دیا ہے تمہارے لیے زمین کو) ایسا نرم بنا دیا جس میں تمہارے لیے چلنا آسان ہو

﴿ فَامْشُوا فِي مَنَاكِبِهَا ﴾

(پس (اطمینان سے) چلو اس کے راستوں پر)اس کے اطراف میں یا اس کے پہاڑوں میں

(سوال)سوال: جواب:

مناکب :"منکب" کی جمع ہے اور مناکب تو جاندار چیزوں کے ہوتے ہیں نہ کہ زمین کے،تو پھر یہاں مناکب کو کیوں ذکر کیا؟

سوال: جواب: (جواب)

یہ زمین کو بہت ذیادہ نرم بنانے کی مثال ہے (یہاں استعارہ تصریحہ ہے کندھوں سے مراد پہاڑوں کے وہ کنارے مراد ہیں جہاں قدرتی درّے بنے ہو تے ہیں)کیونکہ اونٹ کا کندھا سوار کے لیے ناخوشگوار/ نا مناسب ہوتا ہے کہ وہ اس کو روندھے اور وہ سوار کے لیے نرم نہیں ہوتا۔ جب زمین کو نرمی میں بنا دیا گیا ہے اس طرح کہ اس کے اطراف میں چلا جائے تو پس کوئی چیز بھی باقی نہیں رہتی جو نرم نہ ہو(لم يبق شيء لم يتذلل)

﴿وَكُلُوا مِن رِّزْقِهِ﴾

(اور کھاؤ اسکے (دئے ہوئے) رزق سے)اس کی نعمتوں کو تلاش کرو(یہاں کلوا کا معنی تلاش کرنا اس لیے کیا کہ کیونکہ پہلے فعل "فامشوا" ذکر کیا اسی مناسبت کی بناء پر التمسوا کو ذکر کیا)

﴿ وَإِلَيْهِ النُّشُورُ﴾

(اور اسی کی طرف تم کو (قبروں سے) اُٹھ کر جانا ہے)اور اسی کی طرف لوٹنا ہے پس وہ سوال کرے گا ان نعمتوں کے متعلق جو اس نے تم پر کی (مَرْجِعُ) مصدر میمی ہے جو کہ خلاف قیاس ہے کیونکہ مصدر میمی "مَفْعَل " کے وزن پر آتا ہے

﴿ ءَ اَمِنتُم مَّن فِي السَّمَاءِ ﴾

(کیا تم بے خوف ہو گئے ہو اس سے جو آسمانوں میں ہے)یعنی وہ ملائکہ ہیں جن کے سپرد تدبیر عالم کو سرانجام دینا ہے یا اللہ تعالیٰ کی ذات، مراد ہے اس تاویل پر کہ اس سے مراد اس کا امر اور قضاء ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات مراد نہیں ہوگی بلکہ اس کا امر اور قضاء مراد ہونگے کیونکہ اس کے فیصلے اور احکام لوح محفوظ پر رقم ہیں)(اسم جلالہ سے پہلے "قضاء "اور "امر" مضاف مقدر ہونگے)یا پھر عربوں کے گمان کے مطابق فرمایا کیونکہ اہل عرب گمان کیا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں موجود ہے (اللہ رب العزت کو جگہ کے ساتھ مقید کرنا درست نہیں)(مَنْ فِي السَّمَاءِ کے بارے میں علماء کے دو قول ہیں

متاخرین ایسی آیات کی تاویل کرتے ہیں۔ ان کا ایسا محمل بیان کرتے ہیں جو آیاتِ محکمات سے بھی موافقت رکھتا ہوں اور شانِ خداوندی کے بھی شایان

ہو لیکن اسلاف اس کی تاویل نہیں کرتے۔ الفاظ کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہیں لیکن اس کے مفہوم کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ متاخرین کے نزدیک مَنۡ فِی السَّمَاءِ کی یہ تاویل ہوگئی کہ وہ فرشتے جنہیں احکام تکوینی کی تنفیذ کا کام سپرد کیا گیا ہے وہ آسمان میں ہیں مَنۡ فِی السَّمَاءِ سے مراد یہ فرشتے ہیں دوسری تاویل یہ کی گئی کہ قضاء وقدر اور احکام الٰہی کا مخزن آسمانوں میں ہے، لیکن سلفِ صالحین ایسی تاویلیں نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں مَنۡ فِی السَّمَاءِ کا معنی ہے کہ ''جو آسمان میں ہے'' اور اس سے مراد بھی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن وہ آسمان میں کس طرح ہے؟ جس طرح مکین، مکان میں یا مظروف، ظرف میں۔ وہ کہتے ہیں ہم اس کا یقین نہیں کر سکتے۔ وہ ہے آسمان میں لیکن اس طرح جس طرح اس کی شان ِ تنزیہ کے شایان ہے۔ اہل تحقیق نے اسی قول کو پسند کیا ہے۔ نیز یہ بھی ایک طبعی بات ہے کہ جب ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں' فریاد کرتے ہیں' اس سے کوئی سوال کرتے ہیں تو بے ساختہ ہماری نگاہیں آسمان کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ زمین کی طرف نہیں جاتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ذات 'عظمت 'بلندی اور کبریائی سے موصوف ہے۔ اس کے ذکر کے وقت آسمان کی طرف آنکھوں کا اُٹھ جانا ایک قدرتی امر ہے۔ شاید اسی لیے مَنۡ فِی السَّمَاءِ فرمایا۔

اللہ تعالیٰ ورسولہ المکرم اعلم بالصواب (ضیاء القرآن))

ابن کثیر مکی نے اس کو ''وامنتم'' پڑھا ہے پہلے ہمزہ کو ماقبل مضموم ہونے کی وجہ سے واو سے تبدیل کرتے ہوئے پڑھا ہے اور ''بزیءؒ'' کی روایت میں الف فاصل کو ذکر کیے بغیر دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ ''ء امنتم'' پڑھا ہے۔ **قالون** اور **امام ابو عمرو بن العلا البصری** نے الف فاصل کو ذکر کرتے ہوئے دوسرے ہمزہ کی تسہیل کے ساتھ پڑھا ہے اور ''ورش' نے اس ہمزہ کو الف سے بدلتے ہوئے پڑھا ہے یا اس کی تسہیل کے ساتھ بغیر فاصلہ کے اور باقی قراء نے دونوں ہمزوں کو ثابت رکھنے کے ساتھ پڑھا ہے

(**ورش**: ان کا نام ''**عثمان بن سعید االمصری القبطی**'' ہے۔ یہ قبیلہ قریش کے بیٹے اور محقق قراء کے شیخ تھے ان کا دور 110 ہجری سے 197 ہجری تک ہے

قالون: ان کا نام ''**ابو موسیٰ عیسیٰ بن مینا الزرقی**'' ہے۔ یہ قبیلہ بنو زہرہ کے بیٹے تھے۔ ان کا شمار مدینہ کے قراء میں ہوتا ہے ان کا دور 120 ہجری سے 220 ہجری تک ہے

بزی: ان کا نام ''**احمد بن محمد بن عبد اللہ**'' ہے۔ ان کا شمار مکہ کے قراء میں ہوتا ہے اور یہ مسجد الحرام کے مؤذن بھی تھے۔ ان کا دور 170 ہجری سے 250 ہجری تک ہے)

(سوال)سوال: جواب:

تسہیل کیا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

ہمزہ اور ہمزہ کے اوپر حرکت کے موافق جو حرف علت ہو اس کے مخرج کے درمیان پڑھنا اور اپنے مخرج کے درمیان پڑھنا تسہیل کہلاتا ہے

﴿اَنۡ یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ﴾

(کہ تمیں زمین میں غرق کردے) وہ تمہیں زمین میں غائب کردئے جس طرح اس نے قارون کے ساتھ کیا اور یہ ﴿یَّخۡسِفَ بِکُمُ الۡاَرۡضَ﴾ تاویل مصدر ہو کر مَّنۡ فِی السَّمَآءِ سے بدل اشتمال ہے

سوال: جواب: (سوال)

بدل ااشتمال کیسے ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کیونکہ دھنسانا نہ تو فرشتوں کا جزء ہے اور نہ ہی کل کا بلکہ اس فعل کا تعلق فرشتوں کے ساتھ ہے جب حکم ربی ہوتا ہے تو وہ تکمیل کرتے ہیں

﴿ فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴾

(اور وہ زمین تھر تھر کانپنے لگے) مضطرب ہوگئی اور المور تمور کا مصدر ہے آنے جانے میں جو تردد ہوتا ہے اسے مور کہتے ہیں (تمور :ترتجّ وتھتجّ۔زمین کا ہچکولے کھانا اور تھرتھرانا)

﴿ اَمْ اَمِنْتُمْ مَّنْ فِی السَّمَآءِ اَنْ یُّرْسِلَ عَلَیْكُمْ حَاصِبًا ﴾

(کیا تم بےخوف ہوگئے ہواس سے جو آسمانوں میں ہے کہ وہ بھیج دے تم پر بتھر برسانے والی ہوا) کہ وہ ہوا تم پر پتھر برسائے (حصبة کی جمع حصباء آتی ہے)(حاصب: اس تند آندھی کو کہتے ہیں جو گرد وغبار اور سنگریزوں کو اپنے ساتھ اُڑا لے جاتی ہے)

﴿ فَسَتَعْلَمُوْنَ كَیْفَ نَذِیْرِ ﴾

(تب تمہیں پتہ چلے گا کہ میرا ڈرانا کیسا ہوتا ہے) میرا ڈرانا کیسا ہے جب تم خود اس چیز کا مشاہدہ کرلوگے جس کے ساتھ ڈرایا گیا تھا لیکن اس وقت یہ جاننا تمہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا (انذاری سے اس جانب اشارہ ہے کہ نذیر مصدر کے معنی میں ہیں)(''منذر به'' سے مراد زمین کا تھرتھرانا اور پتھروں کی بارش ہے)

﴿ وَلَقَدْ كَذَّبَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَكَیْفَ كَانَ نَكِیْرِ ﴾

(جو لوگ ان سے پہلے گزرا نہوں نے بھی جھٹلایا (خود دیکھ لو) کہ (ان) پر میرا عذاب کتنا سخت تھا) میرا ان پر انکار کرنا کیسا ہے عذاب کے نزول کے ساتھ (انکاری سے اس جانب اشارہ ہے کہ نکیر مصدر کے معنی میں ہیں)اور یہ رسول اللہ ﷺ کو تسلی دینا ہے اور آپ کی قوم کے مشرکین (لوگوں) کو دھمکی دینا ہے

﴿ اَوَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ فَوْقَهُمْ ﴾

(کیا انہوں نے پرندوں کو اپنے اوپر (اُڑتے) کبھی نہیں دیکھا پر پھیلائے ہوئے) صٰٓفّٰتٍ (امام صاحب صافات کا معنی بتا ہے ہیں) یعنی اُڑتے وقت فضا میں پرندوں کا اپنے پروں کو پھیلانا (کیونکہ) پرندے جب اپنے پروں کو پھیلاتے ہیں تو قوادم کو صف در صف کر لیتے ہیں (قوادم: پرندہ کے بازو کے اگلے دس پروں کو۔قوافی: پرندے کے چھوٹے پروں کو قوافی کہتے ہیں)

﴿ وَّیَقْبِضْنَ ﴾

(اور کبھی پر سمیٹ بھی لیتے ہیں) انھیں ملا لیتے ہیں جب انہیں اپنے پہلوؤں پر مارتے ہیں وقتا فوقتا حرکت پر قوت حاصل کرنے کے لیے اور اسی وجہ سے اسم فاعل کے صیغہ سے فعل کے صیغہ کی طرف عدول کیا کہ اُڑنے میں اصل اور جو چیز ان پر طاری ہوہی ہے اس کے درمیان فرق بیان ہوجائے

سوال: جواب: (سوال)

پرندوں کے اُڑنے کی دو حالتیں ہیں 1: پروں کو پھیلانا 2: پروں کو سمیٹنا۔ان میں سے پہلی حالت کو اسم فاعل کے صیغہ صافات اور دوسری کو فعل مضارع کے ساتھ تعبیر کرنے میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

چونکہ اُڑنے میں اصل پروں کا پھیلانا ہے اور اسے اسم فاعل کے ساتھ اس لیے تعبیر کیا کہ جملہ اسمیہ دوام واستمرار پر دلالت کرتا ہے اور دوسری کو مضارع کے ساتھ تعبیر کیا کہ مضارع میں تجدد کا معنی پایا جاتا ہے (الطاری: جو اس کے اوپر طارری ہورہی ہے)

﴿ مَا یُمْسِكُهُنَّ ﴾

(نہیں روکے ہوئے انہیں کوئی (فضا میں)) فضا میں طبیعت کے خلاف

﴿ اِلَّا الرَّحْمٰنُ ﴾

(بجز رحمٰن کے) جس کی رحمت ہر شئی کو شامل ہے کہ ان پرندوں کو ایسی شکلوں اور خصائل پر پیدا کیا گیا ہے جو انہیں اڑنے کے لیے تیار کرتے ہیں

یهیاء: تیار کرنا

﴿ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍۢ بَصِیْرٌ ﴾

(بے شک وہ ہر چیز کو خوب دیکھنے والا ہے) وہ جانتا ہے کہ اس نے کیسے غرائب کو تخلیق کرنا ہے اور کیسے عجائب کی تدبیر کرنا ہے

﴿ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ یَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ ﴾

((اے منکرو!) کیا تمہارے پاس کوئی ایسا لشکر ہے جو تمہاری مدد کرے (خداوند) رحمٰن کے علاوہ) یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے قول ''اولم یروا'' کی عدیل ہے، اس معنی پر کہ کیا وہ غافل رہے اور انہوں نے اس قسم کی کاریگری میں غور وفکر نہیں کیا؟ اور ہمیں عذاب دینے پر اور میں حسانے پر اور ان سے کنکریاں برسانے پر قادر نہ جانا، یا کوئی لشکر ہے جو تمہاری مدد کرے اللہ کے علاوہ اگر وہ تم پر عذاب بھیجے یہ آیت کریمہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرح ہے'' ام لهم الهة تمنعهم من دوننا''

(عدیل لقولہ کے ساتھ امام بیضاوی اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ ''ام'' متصلہ ہے جو دو مساوی امور میں سے ایک کی تعین کے لیے آتا ہے اور یہ ''ام'' متصلہ ہمزہ استفہام کے بعد آتا ہے۔ جس چیز کی تعیین مقصود ہوا کرتی ہے ایک کو ہمزہ کے بعد اور دوسرے کو ام کے بعد ذکر کرتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا مثیل ومقابل ہوتا ہے اسی وجہ سے اس ''ام'' کو ''ام معادلہ'' بھی کہتے ہیں اور دونوں مذکورہ چیزیں ایک دوسرے کی عدیل ہوتی ہیں اور جس چیز کے متعلق یقین ہوتا ہے اُسے درمیان میں ذکر کیا جاتا ہے

مثلاً کتاب عند زاهدٍ ام قلم'' اس میں یقین ہے کہ زاہد کے پاس کچھ ہے لیکن معلوم نہیں کہ قلم ہے یا کتاب ہے پس ایک کو ہمزہ استفہام کے بعد اور دوسرے کو ام کے بعد ذکر کیا یہ دونوں ایک دوسرے کے عدیل ہیں اسی طرح یہ بیان کیا گیا ہے کہ یہ تو یقین ہے کہ انہوں نے ہمیں عذاب پر قادر نہ جانا لیکن تعیین اس بات کی مقصود ہے کہ انہوں نے اس عالم رنگ وبو کے نظام احسن پر تفکر وتدبر نہ کیا یا ان کے پاس کوئی ایسا لشکر ہے جو انہیں ہم سے بچالے گا اور ان کی مدد کرے گا)

(سوال) سوال: جواب:

جب ہمزہ استفہام پہلے مذکور ہے تو ام کے بعد دوبارہ استفہامیہ انداز سے کلام کیوں فرمایا؟

(جواب)

سوال: جواب: مگر یہ کہ جو ان کی مدد کرے گا اس کی تعیین کرنے کے لیے استفہامیہ انداز اپنایا گیا ہے اس بات کا شعور دلاتے ہوئے کہ وہ اس قسم کے کا اعتقاد رکھتے تھے (ان کا اعتقاد تھا کہ'' معبود باطلہ'' مدد کرتے ہیں) اور ''من'' مبتدا ہے اور ''هذا'' اس کی خبر ہے اور الذی موصول اپنے صلہ کے ساتھ ملکر صفت ہے اور ''ینصر کم، جند'' کی صفت ہے جسے لفظوں پر محمول کیا گیا ہے

(سوال) سوال: جواب:

''جند'' میں جمع کا معنی موجود ہے لہذا ضمیر واحد کی بجائے جمع کی ہونی چاہیے تھی؟

سوال: جواب:

کہ لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے واحد کی ضمیر ذکر کی ہے)

﴿ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِیْ غُرُوْرٍ ﴾

(بے شک منکرین دھوکے میں مبتلا ہیں) ان کے لیے کوئی ایسی ذات نہیں جس پر وہ اعتماد کرسکیں صورت میں معتمد اس مفعول کا صیغہ ہوگا کے لیے کوئی ایسی جگہ نہیں جس پر وہ اعتماد کرسکیں صورت میں معتمد اسم ظرف کا صیغہ ہوگا (ان مشابهه بلیس ملغه ہے)

﴿ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ ﴾

(کیا کوئی ایسی ہستی ہے جو تمہیں رزق پہنچائے سکے)(امام بیضاوی اشارہ فرمارہے ہیں کہ یہاں بھی ام منقطع ہے)''ام من '' سے مراد وہ ہے جس کی جانب اشارہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے جو تمہیں رزق دئے گا؟

﴿اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَه﴾

(اگر اللہ تعالیٰ اپنا رزق بند کرلے) بارش روکنے کے ساتھ اور باقی تمام ذرائع کو روک لینے کے ساتھ جو زق کے حصول کا باعث ہیں اور تم تک رزق پہنچانے کا ذریعہ ہیں

(سائر کے دو معنی ہیں 1: باقی 2: تمام ''باقی'' ترجمہ کرنا زیادہ مناسب ہے)

﴿بَلْ لَّجُّوْا﴾

(لیکن یہ لوگ بہت دور نکل گئے) سرکشی میں حد سے تجاوز کر گئے

﴿فِیْ عُتُوٍّ وَّ﴾

(سرکشی میں) حق کی مخالفت میں

﴿نُفُوْرٍ﴾

(اور حق سے نفرت میں) اپنی طبائع کے حق سے انتہائی دور ہونے کے باعث حق سے نفرت کرنے پر ڈٹے رہے

﴿اَفَمَنْ یَّمْشِیْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖۤ اَهْدٰۤى﴾

(کیا وہ شخص جو منہ کے بل گرتا پڑتا چلا جا رہا ہے وہ راہِ راست پر ہے) کہا جاتا ہے میں نے اسے گرایا پس وہ گر گیا (یہ بات مشہور ہے کہ فعل لازم کو جب ''باب افعال'' میں لائیں تو وہ متعدی بن جاتا ہے اور اگر پہلے ہی متعدی ہو تو متعدی بدو مفعول بن جاتا ہے اور اگر متعدی بدو مفعول ہو تو متعدی سہ مفعول بن جاتا ہے جیسے

زیادۃ بناء تدل علی زیادۃ المعنی

الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے

یعنی معنی میں تاکید حاصل ہوتی ہے

لیکن بارہ، تیرہ الفاظ ایسے ہیں جو ثلاثی میں متعدی ہوتے ہیں لیکن جب انہیں مزید فیہ میں لایا جائے تو وہ لازم بن جاتے ہیں علامہ بیضاوی ''وھو من الغرائب '' کی عبارت کے ساتھ بتا رہے ہیں کہ یہ لغت عرب کے غرائب میں سے ہے) جیسے اللہ تعالیٰ نے بادل کو دور کیا پس بادل دور ہو گیا غرائب کے اوپر جو الف لام ہے وہ مضاف الیہ جو کہ ''لغۃ'' ہے کہ عوض آیا ہے اور تحقیق یہ دونوں باب انفعل سے صار ذا کب ،ذا قشع کے معنی میں ہیں اور کب ،قشع میں مطاوعت نہیں بلکہ ان کا مطاوع انکب اور انقشع ہے نہ کہ ''کَبَّ اور قَشَعَ (یہ ٹھوکر کھانے والا ہو گیا اور بادل چھٹنے والا ہو گیا یعنی صار کے معنی ہو گئے ہیں اس

جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ باب افعال کا خاصہ صیرورت پایا جارہا ہے)

هی صیرورة ما هو فاعل افعل صاحب الشیء

باب افعل کے فاعل کا صاحب الشیء ہو جانا

یہ باب انفعال کا خاصہ ہے

المطاوعة هو قبول اثر الناشی من تعلق الفعل المتعدی

فعل متعدی کے تعلق سے پیدا ہونے والے اثر کو قبول کرنا

جیسے کسرتُ [میں نے اسے توڑا] انکسر وہ ٹوٹ گیا کسر فعل متعدی ہے اور انکسر لازم ہے۔ جو فعل کا اثر قبول کررہا ہوا سے مطاوِع کہتے ہیں اور جس کی اطاعت کی جارہی ہوا سے مطاوَع کہتے ہیں۔ وہ الفاظ جو ثلاثی مجرد سے مزید فیہ میں آکر لازم بن جاتے ہیں

﴿اَمَّنْ یَّمْشِیْ سَوِیًّا﴾

(یا جو گامزن ہے سیدھا ہو کر) وہ لغزش سے صحیح سلامت سیدھا چلتا ہے

﴿عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ﴾

(صراط مستقیم پر) جس کے اجزاء اور جہت برابر ہو اس آیت کریمہ سے مشرک اور موحد کا پیرو کار دو مسلکوں اور دو دینوں کو دو راستوں کے ساتھ تشبیہ دینا ہے مسلک سے مراد راستہ ہے

سوال: جواب: (سوال)

مومن کے ذکر کے ساتھ اس کے راستہ کا بھی ذکر کیا لیکن کافر کے راستہ کو ذکر نہیں کیا، اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

شاید الکب میں مسلک کے حال پر جو دلالت پائی جارہی ہے اس پر اکتفاء کیا گیا ہے اس بات کا شعور دلانے کے لیے کہ مشرک جس راستے پر گامزن ہے وہ حقیقت قابل ہی نہیں کہ اُسے راستے کا نام دیا جائے۔ وہ اس پر اس طرح چلتا ہے جس طرح کہ بھٹکنے والا غیر ہموار جگہ میں چلا کرتا ہے اور "مکب" سے مراد اندھا ہے کیونکہ وہ بھٹکتا ہے اور منہ کے بل گر پڑتا ہے اور

" السوی " سے مراد " البصیر " ہے صاحب بصیرت ہو اور کہا گیا ہے

"من یمشی مکبا" سے مراد وہ ہے جس کو منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے دوزخ کی طرف لایا جائے گا

اور "من یمشی سویا" سے مراد وہ ہے جو اپنے قدموں پر چلتا ہوا جنت کی طرف جائے گا

﴿قُلْ هُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَكُمْ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ﴾

(آپ فرمایئے وہی تو ہے جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے کان، بنائے) تاکہ تم واعظ نصیحت کو سنو

﴿وَالْاَبْصَارَ﴾

(آنکھیں) تاکہ تم اس کی کاریگی میں غور و فکر کرو اور عبرت حاصل کرو

﴿وَالْاَفْـِٕدَةَ﴾

(اور دل بنائے) تاکہ تم غور و فکر کرو اور عبرت حاصل کرو

﴿ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ﴾

((لیکن) تم بہت کم شکر کیا کرتے ہو) ان اعضاء کو ان کاموں میں استعمال کرنے کے ساتھ جن کے لیے ان کو تخلیق کیا گیا ہے

﴿ قُلْ هُوَ الَّذِىْ ذَرَاَكُمْ فِى الْاَرْضِ وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴾

(آپ فرمایئے اسی نے تم کو پھیلا دیا زمین میں اور (روزِ) محشر تم اسی کے پاس جمع کیے جاؤ گے) جزاء کے لیے (یہاں جزاء سے مراد بدلہ ہے)

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ﴾

((کفار از راہِ مذاق) پوچھتے ہیں کہ (بتائیں) یہ وعدہ کب پورا ہوگا) یعنی حشر یا قیامت کب قائم ہوگی یا جو ان سے دھنسانے اور کنکریاں برسانے کا وعدہ کیا گیا ہے وہ کب پورا ہوگا

﴿ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾

(اگر تم سچے ہو) اس سے ان کی مراد نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور مومنین تھے

﴿ قل اِنَّمَا الْعِلْمُ ﴾

(آپ فرمایئے (اس کا) علم ہے) قیامت کے قائم ہونے کا علم

﴿عِنْدَاللّٰهِ﴾

(تو اللہ ہی کے پاس) اور یا قیامت کے علم یا اس کا غیر بذات خود مطلع نہیں ہوسکتا

﴿ وَاِنَّمَاۤ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ﴾

(میں تو محض واضح طور پر خبردار کرنیوالا ہوں)

سوال: جواب: (سوال)

جب ایک شخص کو کسی چیز کے بارے علم ہی نہیں تو پھر ڈرانا کیسے ممکن ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

ڈرانے کے لیے علم بلکہ محذر منہ کے وقوع کا ظن ہی کافی ہوتا ہے

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهُ﴾

(پھر جس وقت دیکھیں گے) یعنی وعدہ (بتا رہے ہیں کہ "ہ" ضمیر کا مرجع "الوعد" ہے) "وعد" موعود کے معنٰی میں ہے

﴿ زُلْفَةً ﴾

(اسے قریب آتے) ذَالفةٍ سے اس جانب اشارہ کیا جا رہا ہے کہ "زُلْفَة" اسمِ جامد ہے جو کہ "ہ" سے خبر بن رہا ہے جبکہ جامد خبر بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا اس لیے بتا رہے ہیں کہ اس سے پہلے "ذا" محذوف نکالے گئے اور اس کا معنی ہے جب وہ اس کو قریب دیکھے گئے

﴿سِيْٓـَٔتْ وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

(تو کافروں کے چہرے بگڑ جائیں گے) اور اس کی وجہ اندر کا غم ہوگا اور عذاب کا دیکھنا ہوگا جو ان کے چہروں کو سیاہ کردے گا

﴿وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِىْ كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴾

(اور انہیں کہا جائے گا کہ یہ ہے جس کا تم بار بار مطالبہ کرتے تھے) (تَدَّعُوْنَ) جس کا تم مطالبہ کرتے تھے اور جس کے لیے تم جلدی کیا کرتے تھے اس صورت میں یہ "دعا" سے باب افتعال ہے یا معنی یہ ہوگا وہ جس کی وجہ سے تم دعوی کیا کرتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ یا اٹھائے جانے کی کوئی اصل نہیں ہے اس صورت میں یہ "الدعوی" سے مشتق ہوگا

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَهْلَكَنِیَ اللّٰهُ﴾

(آپ فرمایئے (اے منکرو!) ذرا غورتو کرو ہلاک کردے اگر اللہ تعالیٰ مجھے) مجھے موت دے دے

﴿وَمَنْ مَّعِیَ﴾

(اور جو میرے ساتھ ہیں) اور جو میرے ساتھ مومنین ہیں

﴿اَوْ رَحِمَنَا﴾

(یا ہم پر رحم فرمادے) ہماری موتوں کو مؤخر کرنے کے ساتھ

﴿فَمَنْ یُّجِیْرُ الْكٰفِرِیْنَ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ﴾

(تو کون بچالے گا کافروں کو دردناک عذاب سے) کوئی بھی انہیں عذاب سے نجات نہیں دے گا خواہ ہم مرجائے یا زندہ رہیں۔اور یہ کفار کے قول "نتربص به ریب المنون" ﴿ہم حوادثاتِ زمانہ کا انتظار کرتے ہیں/ ہم موت کے نازل ہونے کا انتظار کرتے ہیں﴾ کا جواب ہے (جب نبی آخرزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان نبوت فرمایا تو آپ کے اصحاب ظاہری طور پر مال واسباب سے پاک تھے جب کفار نے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ چند غریب لوگ ایمان لے آئیں ہیں جو کہ کوئی بڑی بات نہیں البتہ اگر حالات سازگار ہوگئے تو ہم بھی ایمان لے آئیں گئے) (المنون :منون زمانے کو بھی کہتے ہیں اور موت کو بھی کہتے ہیں) (ریب: اس کا ایک معنی ہے پریشان کرنا اور ایک معنی ہے نازل ہونا)

﴿قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ﴾

(فرمایئے وہ (میرا خالق) بڑا ہی مہربان ہے) جس کی طرف میں تمہیں بلاتا ہوں جو تمام نعمتوں مالک ہے

﴿اٰمَنَّا بِهٖ﴾

(ہم اسی پر ایمان لائے ہیں) یہ جانتے ہوئے کہ وہ تمام نعمتوں کا مالک ہے/ تمام کائنات کا مالک ہے

﴿وَعَلَیْهِ تَوَكَّلْنَا﴾

(اور اسی پر ہم نے توکل کیا ہوا ہے) اس پر اعتماد کرتے ہوئے اور یہ جانتے ہوئے کہ اس کے علاوہ بالذات نہ تو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی نفع۔اور صلہ کو مقدم کرنا تحصیص کے لیے ہے اور اس بات کا شعور دلانے کے لیے کہ اس کا غیر کوئی نفع ونقصان نہیں پہنچا سکتا/ اور وہی ایک ایسی ذات ہے جس پر ہمیں توکل کرنا چاہیے

سوال: جواب: (سوال)

جار، مجرور، مفعول وغیرہ تو فعل کے بعد آتے ہیں یہاں جار مجرور کو مقدم کیوں کیا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

جار، مجرور وغیرہ کو مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوتا ہے جیسے ایاك نعبد ﴿ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں﴾ (اس سے ایک بات یہ بھی معلوم ہو ہی ہے کہ علامہ بیضاوی اودیگر مفسرین کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ کوئی شخص بالذات نہ تو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نفع دے سکتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کے ساتھ نفع ونقصان پہنچا سکتا ہے)

﴿فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ﴾

(پس عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ کھلی گمراہی میں کون ہے) ہم میں سے اور تم میں سے اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے فَسَیَعْلَمُوْنَ پڑھا ہے

﴿قُلْ اَرَءَیْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا﴾

(آپ پوچھیے اگر کسی صبح تمہارا پانی زمین کی تہہ میں اُتر جائے) زمین میں دھنسنے والا ہو جائے اس طرح کہ ڈول اس تک نہ پہنچ سکیں، ''غـور ا'' مصدر ہے جس کے ساتھ صفت بیان کی گئی ہے (غائر سے اس جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ غور مصدر ہے جو کہ غائر اسم فاعل کے معنی میں ہے) (اَصْبَحَ بمعنٰی صار ہے)

﴿ فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴾

(تو تمہیں میٹھا صاف پانی کون لا دے گا؟) جاری پانی یا ایسا ظاہر پانی جس کا حاصل کرنا آسان ہو۔ (علامہ بیضاوی نے یہاں دو معنٰی بیان کیے ہیں 1: اگر معین، فعیل کے وزن پہ ہو تو اس کا معنی ہوگا جاری پانی اگر یہ ''عان'' سے مفعول کے وزن پر ہو تو اس کا معنی ہوگا ظاہر پانی)

(اللّٰھم جعل حیاتنا ھدی للنا)(امین)

سورة نمبر	سورہ القلم	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات

﴿ نٓ ﴾

(ن) یہ اسماء حروف میں سے ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ مچھلی کا نام ہے (کیونکہ عربی میں مچھلی کو بھی ''نون'' کہتے ہیں اور مچھلی والے کو ''ذوالنون'' کہتے ہیں) اور اس سے یا تو مچھلی کی جنس مراد ہے یا ''یھموت'' نامی مچھلی مراد ہے، جس پر زمین قائم ہے یا اس سے مراد ''دواة'' ہے کیونکہ بعض مچھلیوں سے ایسی چیز نکالی جاتی ہے جو روشنائی/ سیاہی سے بھی زیادہ سیاہ ہوتی ہے اور اس سے لکھا جاتا ہے اور اسے حرف کی صورت میں لکھا جانا پہلے قول کی تائید کرتا ہے کہ یہ اسماء حروف میں سے ہے

﴿ وَالْقَلَمِ ﴾

(قسم ہے قلم کی) اس سے مراد یا تو وہ قلم ہے جس نے لوحِ محفوظ کا لکھا ہے یا وہ قلم مراد ہے جس سے عام طور پر لکھا جاتا ہے

(سوال) سوال: جواب:

اللہ تعالیٰ نے قلم کی قسم کیوں اُٹھائی؟

(جواب) سوال: جواب:

قلم کی قسم اس کے کثرت فوائد کی بناء پر اٹھائی گئی ہے (قلم کے بے شمار فوائد ہیں اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی مدد سے علم کو مقید کیا جاتا ہے جس سے آئندہ نسلیں مستفید ہوتی ہیں)

اور امام ابن عامر شامی اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی اور یعقوب حضرمی بصری نے ''واؤ'' منفصل کو متصل کی جگہ رکھتے ہوئے ''نون'' میں اخفاء کیا ہے۔ ''نون'' کے ساتھ جب حروف فم ملے ہو تو اس میں اخفاء کیا جاتا ہے اور یہ قول امام نافع مدنی اور ابن عامر شامی سے مروی ہے اور ''نون'' کو فتح و کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جیسے ''ص'' کو ''صَادَ'' پڑھا گیا ہے

﴿ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ﴾

(اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں) اور جو وہ لکھتے ہیں ''یسطرون'' میں واو جمع کا مرجع پہلے معنی کی صورت میں علی وجه التعظیم قلم ہے (یعنی تعظیم کی وجہ سے) اور دوسرے معنی کی صورت میں جنس قلم ہے

(سوال) سوال: جواب:

یہاں جمع کی ضمیر کیوں ذکر کی، جبکہ قلم تو مفرد ہے؟

(جواب) سوال: جواب:

جب قلم سے مراد وہ قلم ہو جس نے لوح کو لکھا ہے تو اس قلم کی تعظیم کے لیے اس کی طرف جمع کی ضمیر راجع ہے اور اگر قلم سے مراد عام قلم مراد ہو تو جمع کی ضمیر جنس کے ارادہ کی وجہ سے ہے)

(سوال) سوال: جواب:

فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی بجائے اسم آلہ کی طرف کرنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

فعل کی نسبت اسم آلہ کی طرف کرنا اور صاحب علم کی جگہ قلم کو رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ قلم، صاحب علم کے قائم مقام ہوتا ہے یا قلم سے پہلے اصحاب کا لفظ محذوف ہے اور ضمیر اس کی طرف راجع ہے یا ضمیر کا مرجع فرشتے ہیں اور "ما" مصدریہ ہے یا موصولہ ہے (اگر "ما" اسم موصول ہو تو عبارت یوں ہوگی "الذي يسطرونها"، ضمیر اسم موصول کی طرف راجع ہوگی)

﴿ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ﴾

(آپ اپنے رب کے فضل سے مجنوں نہیں ہیں) یہ جواب قسم ہے اور معنی یہ ہے کہ آپ مجنوں نہیں درآنحالیکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت اور رائے کی پختگی کے ساتھ انعام فرمایا گیا ہے۔

سوال: جواب: (سوال)

امام بیضاوی "منعماً بنعمتِ ربك" کی عبارت سے اس جانب اشارہ کررہے ہیں کہ "بنعمةِ ربك" ترکیب کلام میں حال واقع ہو رہا ہے جبکہ حال کے لیے عامل کا ہونا ضروری ہے اور یہاں عامل تو موجود ہی نہیں پھر حال بنانا کیسے درست ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

حال میں نفی کا معنی عامل ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حال کا عامل "مجنون" شبہ فعل ہے

سوال: جواب: (سوال)

اسم مجرور، حرف جار سے ماقبل میں عمل نہیں کرتا تو اسم مجرور 'مجنون' ماقبل میں کیسے عامل ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

"ب" ماقبل میں عمل کرنے سے مانع نہیں کیونکہ "ب" زائدہ ہے

سوال: جواب: (سوال)

"ب" زائدہ ہونے کی کیا دلیل ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ" میں "ما" مشابہ بلیس ہے اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ "ما" مشابہ بلیس کی خبر پر "ب" زائدہ آجاتی ہے جیسے "ما الفقر بعيب"

﴿ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا ﴾

(اور یقیناً آپ کے لیے ایسا اجر ہے) وحی کے بارگراں کو اُٹھانے اور دین کی تبلیغ وارشاد کرنے پر 'مجنون' شبہ فعل کو عامل بنانے میں ایک اعراض وارد ہوتا ہے

(اعتراض)

اعتراض یہ ہے کہ اگر "مجنون" شبہ فعل کو عامل بنایا جائے تو معنی ہوگا

''جب تک اللہ تعالیٰ آپ ﷺ پر انعام فرماتا ہیاس وقت تک آپ ﷺ مجنوں نہیں ہیں لیکن اگر خداوند قدوس انعام نہ فرمائے تو آپ ﷺ نعوذ باللہ مجنوں ہو گئے'' حالانکہ یہاں تو مطلقا حضور ﷺ سے جنون کی نفی مقصود ہے، لہذا مجنون کو عامل بنانے میں جنون کا احتمال باقی رہ جاتا ہے

(جواب)

اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی کوئی حالت موجود ہی نہیں جس میں آپ ﷺ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات کی بارش نہ ہوتی ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے ''وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى'' اور یقیناً ہر آنے والی گھڑی آپ کے لیے پہلی سے (بدرجہا) بہتر ہے لہذا جنون کی مطلقا نفی خود بخود ہو جاتی ہے اور جنون کا کوئی احتمال باقی نہیں رہتا

﴿غَيْرَ مَمْنُوْنٍ﴾

(جو کبھی ختم نہ ہوگا) یعنی کبھی منقطع نہیں ہوگا یا لوگوں کی طرف سے آپ ﷺ پر کوئی احسان نہیں جتلا سکے گا کیونکہ اللہ آپ کو بغیر کسی وسیلہ کے عطا فرماتا ہے (ممنون مقطوع : کٹ جانا ٹوٹ جانا منقطع ہونا)

﴿وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ﴾

(اور بے شک آپ عظیم الشان خلق کے مالک ہیں) کیونکہ آپ ﷺ نے اپنی قوم سے ایسے مظالم برداشت فرمائے ہیں کہ آپ ﷺ کی مثل دوسرے انبیا ایسے مظالم برداشت نہ کر پاتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپ ﷺ کے خلق کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا کیا تو نے قرآن نہیں پڑھا، قد افلح المومنون

﴿فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ﴾

(عنقریب آپ بھی دیکھیں گے اور وہ بھی دیکھ لیں گے۔ کہ تم میں سے (واقعی) مجنون کون ہے) تم میں سے کون ہے جسے جنون لاحق ہے اس صورت میں ''مفتون'' مصدر ہے جس طرح ''معقول'' اور ''مجلود'' (مفعول کے وزن پر ہونے کے باوجود) مصدر ہیں یا تمہارے دونوں گرہوں میں سے کس گروہ کو جنون لاحق ہے کیا گروہ کافرین کو یا گروہ مؤمنین کو یعنی ان دونوں فریقوں میں سے کون اس مجنوں کے اسم کا زیادہ مستحق ہے

﴿اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ﴾

(بے شک آپ کا رب خوب جانتا ہے ان کو جو اس کی راہ سے بہک گئے ہیں) وہی درحقیقت مجنوں ہیں ''وهم المجانين'' کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ اصل کلام یوں ہے ''اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِالمجانين والعقلاء

﴿وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾

(اور انہیں بھی خوب جانتا ہے جو ہدایت یافتہ ہیں) یعنی کمال عقل کے ذریعے کامیابی حاصل کرنے والے ہیں

سوال: جواب: (سوال)

''مهتدين '' کا معنی ''کمال عقل والے'' کیا گیا ہے اس میں کیا حکمت عملی ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

''المهتدين '' کا لفظ ''المجانين'' کے مقابلہ میں آیا ہے اس لیے ''المهتدين '' سے ''کمال عقل والے'' یہ معنی مراد لینا زیادہ بہتر ہے

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾

(پس آپ بات نہ مانیں ان جھٹلانے والوں کی)

سوال: جواب: (سوال)

معترض اعتراض کرتا ہے کہ کیا اس سے پہلے حضور ﷺ (نعوذ باللہ) جھٹلانے والوں کی اطاعت کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ اس آیت میں فعل نہی کو استعمال

کیا ہے اور فعل نہی اس صورت میں استعمال ہوتا ہے جب ماضی میں اس کام کا ارتکاب کیا گیا ہو پھر اس سے روکنا مقصود ہو حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کفار کی کبھی پیروی کی ہی نہیں؟

(جواب)

(فعل نہی اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان کی نافرمانی پر مصمم ارادہ کے لیے برانگیختہ کرنا ہے

﴿ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ ﴾

(وہ تو تمنا کرتے ہیں کہ کہیں آپ نرمی اختیار کریں) اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ نرمی کریں کہ ان کو شرک سے روکنا ختم کر دیں یا کبھی کبھی ان کی موافقت کریں

﴿ فَيُدْهِنُوْنَ ﴾

(تو وہ بھی نرم پڑ جائیں) پس وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نرمی کریں طعن کو ختم کرنے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی موافقت کرنے کے ساتھ۔ اور (فَيُدْهِنُوْنَ میں) "ف" عاطفہ ہے یعنی انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی کو چاہا اور اسکی تمنا کی لیکن انہوں نے اپنی نرمی کو مؤخر کیا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نرمی اختیار فرمائیں یا (فَيُدْهِنُوْنَ میں) "ف" سببیہ ہے یعنی انہوں نے چاہا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نرمی کریں تو اس وقت رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نرمی کرنے کے سبب رضی اللہ عنہم بھی نرمی کریں گئے یا انہوں نے طمع کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی کا پس اب وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے نرمی کرنے میں طمع کرتے ہوئے نرمی کریں گئے

(اگر (فَيُدْهِنُوْنَ میں) "ف" عاطفہ ہو تو اس وقت "ف" ترتیب مع تعقیب کے لیے ہوگی اور معنی ہوگا "پہلے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نرمی فرمائیں پھر کفار بھی نرمی کریں گئے) (اگر (فَيُدْهِنُوْنَ میں) "ف" سببیہ ہو تو معنی ہوگا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نرمی کے بعد نرمی کریں گے (ترکیبی اعتبار سے اس وقت فَيُدْهِنُوْنَ) مبتداء محذوف "ھم" کی خبر ہوگئی کیونکہ "ف سببیہ" افعال پر داخل نہیں ہوتی

﴿ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ ﴾

(اور نہ بات مانیے کسی (جھوٹی) قسمیں کھانے والے) جو حق و باطل میں کثیر قسمیں کھانے والا ہے

﴿ مَّهِيْنٍ ﴾

(ذلیل شخص کی) حقیر رائے والا، یہ "مهانة" سے ماخوذ ہے جس کا معنی حقارت ہے

﴿ هَمَّازٍ ﴾

(جو بہت نکتہ چین) عیب جو (ہے)

﴿ مَّشَّآءٍ بِنَمِيْمٍ ﴾

(چغلیاں کھاتا پھرتا ہے) ادھر کی بات ادھر بیان کرتا ہے

﴿ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ ﴾

(سخت منع کرنے والا بھلائی سے) لوگوں کو ایمان۔ انفاق فی سبیل اللہ، اور عمل صالح جیسے بھلائی کے کاموں سے روکتا ہے

﴿ مُعْتَدٍ ﴾

(حد سے بڑھا ہوا) ظلم میں حد سے بڑھنے والا ہے

﴿ اَثِيْمٍ ﴾

(بڑا بدکار ہے) بہت زیادہ گناہ کرنے والا (ہے)

﴿ عُتُلٍّ ﴾

(اکھڑمزاج ہے) خشک مزاج، پتھردل/سخت دل ہے یہ'' عتله '' سے مشتق ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی کسی شخص کسی کو سختی اور درشتی کے ساتھ کھینچے

﴿ بَعْدَ ذٰلِكَ ﴾

(اس کے علاوہ) اس کی جن خصلتوں/ عیبوب کو شمار کیا گیا ہے اس کے علاوہ

﴿زَنِيۡمٍ﴾

(بداصل ہے) ولدالزنا/حرامی ہے۔ یہ'' زَنَمَتَي الشاه '' سے ماخوذ ہے یہ چمڑے کے دو چھوٹے ٹکرے ہوتے ہیں جو بکری کے کان اور حلق کے اردگرد لٹک رہے ہوتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد **ولید بن مغیرہ** ہے اس کے باپ نے اس کی پیدائش کے آٹھارویں سال یہ دعوی کیا (کہ یہ میرا بیٹا ہے)اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد **اخنس بن شریق** ہے۔

اصل میں یہ قبیلہ ثقیف میں سے تھا لیکن اس کا شمار بنو زہرہ میں ہوتا تھا (یعنی لوگ اسے بنو زہرہ کا بیٹا/فرد گمان کیا کرتے تھے)

﴿ اَنۡ كَانَ ذَا مَالٍ وَّ بَنِيۡنَ اِذَا تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ ﴾

((یہ غرور وسرکشی) اس لیے کہ وہ مالدار اور صاحبِ اولاد ہے، جب پڑھی جاتی ہیں اس کے سامنے ہماری آیتیں تو کہتا کہ یہ پہلے لوگوں کے افسانے ہیں) یہ بات کہتا جس وقت وہ مالدار تھا اور غرور کی زیادتی کی وجہ سے بیٹوں کے ساتھ غلبہ حاصل کرنے/غلبہ پانے والا تھا۔

(سوال) سوال: جواب:

''أن كان''، میں عامل کون ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

(لیکن) اس میں عامل قال کا مدلول ہے نہ کہ بذات خود قال ہے کیونکہ شرط کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا

(قال کا مدلول ''كَذَّبَ'' ہے یعنی ''أن كان''، ''كَذَّبَ'' کی علت ہے جس سے قبل لام تعلیل محذوف ہے)

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ **لاتطع** کے لیے علت ہو۔ (یعنی '' لا تطع ''، کا مفعول لہ ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا)

یعنی آپ ﷺ اس شخص کی اطاعت نہ کریں جس میں یہ نقائص ہوں۔ کہ (آپ ﷺ اس لیے اس کی پروی کرنا چاہتے ہیں کہ) وہ صاحب مال ہے

ابن عامر شامی ،امام حمزہ بن الذیات الکوفی ، اما م علی بن حمزہ الکسائی الکوفی اور یعقوب حضرمی بصری نے اس کو استفہام کے طور پر'' **أأن كان** '' پڑھا ہے مگر ابن عامر شامی نے دوسرے ہمزہ کو بین بین پڑھا ہے

''اَلِاَن كَانَ '' کا تعلق مابعد کے ساتھ ہو تو معنی ہوگا ''اَلِاَن كَانَ ذا مالٍ كذَّبَ'' کیا صاحب مال ہونے کی وجہ سے وہ آیات بینات کی تکذیب کرتا ہے۔

اگر '' لِاَن كَانَ ''، کا تعلق ماقبل سے ہو تو معنی ہوگا ''اَتُطِيعُهُ لِاَن كَانَ ذامالٍ '' کیا آپ ﷺ اس کے صاحب مال ہونے کی وجہ سے اس کی پیروی کرنا چاہتے ہیں یا کیا آپ ﷺ اس کی اطاعت کرتے ہیں اس کے صاحب مال ہونے کی وجہ سے۔ اس کو کسرہ کے ساتھ **ان كان** بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں طاعت سے منع کرنے میں غنٰی (خوشحالی) کی شرط عائد کرنا اسی طرح ہے جس طرح اولاد کو قتل کرنے سے روکنے میں فقر علت ہے

یا یہ شرط مخاطب کے لیے ہے جس کی ﷺ یہ ہوگی کہ آپ ﷺ اس کی خوشحالی کو شرط بناتے ہوئے اس کی پروی نہ کیجئے کیونکہ جب مخاطب خوشحالی کی وجہ سے اس کی پیروی کرے گا تو گویا اس نے اطاعت کرنے میں خوشحالی کو شرط بنالیا

﴿ سَنَسِمُهٗ ﴾

(ہم بہت جلد داغ لگائیں گے) کا و یہ کے ساتھ

﴿عَلَى الْخُرْطُوْمِ﴾

(اس کی سونڈ پر) ناک پر اور جنگ بدر میں ولید بن مغیرہ کی ناک پر ایک زخم لگا تھا جس کا نشان باقی رہا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ اس بات سے عبارت ہے کہ اللہ تعالی اسے انتہائی ذلیل کرے گا جس طرح عربوں کا قول ہے اس کی ناک کو کاٹ دیا گیا اس کی ناک خاک آلود ہوئی

﴿اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ﴾

(ہم نے ان (مکہ والوں) کو بھی آزمایا)

سوال: جواب: (سوال)

جسم کے تمام حصوں میں عیب کے لیے ناک کو ہی کیوں مخصوص کیا اس میں کیا حکمت عملی ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

چہرے پر داغنا خصوصا ناک پر واضح عیب ہے یا قیامت کے دن ہم اس کے چہرے کو سیاہ کر دئے گئے

﴿كَمَا بَلَوْنَآ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ﴾

(جیسے ہم نے آزمایا تھا باغ والوں کو) اس سے مراد وہ باغ ہے جو صنعاء سے دوفرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ یہ باغ ایک نیک آدمی کی ملکیت تھا وہ کٹائی کے وقت فقراء کو بلاتا اور ان کے لیے جو پھل درانتی چھوڑ دیتی یا جس پھل کو ہوا گرا دیتی یا جو پھل اس کپڑے سے دور گرتا جسے درخت کے نیچے بچھایا جاتا تاکہ اس پر پھل گرے پس ان فقراء کے لیے بہت سی اشیاء جمع ہو جاتی، جب وہ مرگیا تو اس کے بیٹوں نے کہا اگر ہم نے اسی طرح کیا جیسے ہمارا باپ کیا کرتا تھا تو ہم پر تنگی آجائے گی پس انہوں نے قسم کھائی کہ وہ باغ کے پھلوں کو مساکین سے چوری چھپے صبح کے وقت کاٹ لیں گئے

﴿اِذْ اَقْسَمُوْا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِيْنَ﴾

(جب انہوں نے قسم اٹھائی کہ وہ ضرور توڑ لیں گئے اس کا پھل صبح سویرے) وہ اس کے پھل صبح سویرے ضرور توڑ لیں گئے

﴿وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ﴾

(اور انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا) اور انہوں نے انشاء اللہ بھی نہ کہا

(سوال)

انشاء اللہ کو استثناء کا نام کیوں دیا گیا ہے؟

(جواب اول)

انشاء اللہ کو استثناء کا نام دیا گیا ہے کیونکہ انشاء اللہ میں بھی اخراج "نکالنا" کا مفہوم پایا جاتا ہے مگر انشاء اللہ کے ساتھ اخراج مذکور کے خلاف ہوتا ہے (یعنی مستثنیٰ منہ کی جنس سے نہیں ہوتا اور مستثنی منقطع ہوتا ہے) اور استثناء کے ساتھ اخراج اس کا عین ہوتا ہے (یعنی مستثنی، مستثنی منہ کی جنس سے ہوتا ہے اور مستثنی متصل ہوتا ہے (دوسرا جواب) انشاء اللہ کو استثناء نام دیا گیا ہے کیونکہ "لا اخرج انشاء اللہ" اور لا اخرج انشاء اللہ دونوں کا ایک ہی مفہوم ہے یا وہ مساکین کا حصہ نہیں نکالا کرتے تھے جیسے ان کا باپ مساکین کا حصہ نکالا کرتا تھا

(اولا یستثنون حصة المساکین کما کان یخرج ابوھم کا عطف ولا یقولون انشاء اللہ پر ہے)

﴿فَطَافَ عَلَيْهَا﴾

(پس چکر لگا گیا) اس باغ پر (امام بیضاوی "علی الجنة" سے ضمیر کے مرجع کے بارے میں اشارہ فرمایا ہے)

﴿طَآئِفٌ﴾

(ایک چکر لگانے والا) ایسی مصیبت جو چکر لگانے والی تھی ("بلاء طائف" سے اس جانب اشارہ ہے کہ "طائف" صفت ہے جس کا موصوف "بلا

ء'' محذوف ہے)

﴿مِّنْ رَّبِّكَ﴾

(آپ کے رب کی طرف سے)رب کی طرف سے اس کی ابتداء ہوئی (یہاں من ابتدائیہ ہے)

﴿ وَهُمْ نَآئِمُوْن فَاَصْبَحَتْ كَالصَّرِيْمِ﴾

(دراں حالیکہ وہ سوئے ہوئے تھے چناچہ (لہلہاتا) باغ کٹے ہوئے کھیت کی مانند ہوگیا) اس باغ کی طرح جس کے پھل توڑ لیے گئے ہو اس میں کوئی چیز باقی نہ رہی ہو۔(اس صورت میں)فعیل،مفعول کے معنی میں ہے یا جل جانے اور سیاہ ہوجانے کی وجہ سے رات کی طرح ہوگیا۔یا فرط یبس ﷺ زیادہ سفیدی کی وجہ سےﷺن کی طرح ہوگیا

سوال:جواب:(سوال)

رات اور دن کو صریم کا نام کیوں دیا گیا حالانکہ یہ دونوں متضاد ہیں؟ایک لفظ کا دو متضاد چیزوں سے معنی کیسے درست ہوگا ؟

سوال:جواب:(جواب)

ان میں سے ہر ایک کو صریم کا نام دیا گیا کیونکہ ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھی/ صاحب سے جدا ہوتا ہے۔یا وہ ریت کے ﷺ طرح ہوگیا (ایسی ریت کا ڈھیر جہاں کوئی چیز نہیں اُگتی)

﴿فَتَنَادَوْا مُصْبِحِيْنَ اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ﴾

(پھر انہوں نے ایک دوسرے کو ندادی صبح سویرے،کہ سویرے سویرے اپنے کھیت کی طرف چلو) کہ سویرے سویرے اپنے کھیت کی طرف چلو۔

(''ای اخرجوا'' سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''أن'' مفسرہ ہے)یعنی نکلو اپنے کھیت کی طرف صبح صبح (''بأن اخرجوا'' سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''أن'' مصدریہ ہے)

سوال:جواب:(سوال)

''غدا یغدو'' کا فعل ''الی'' کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے پھر یہاں ''علی'' کے ساتھ کیوں ذکر کیا گیا ہے؟

سوال:جواب:(جواب)

فعل کو ''علی'' کے ساتھ متعدی کرنا اس بناء پر ہے کہ یا تو یہ اپنے ضمن میں ''اقبل یقبل اقبال'' آگے بڑھنا/جلدی کرنا کے معنی کو متضمن ہے یا صبح کے وقت کٹائی کرنے کے لیے نکلنے کو تشبیہ دی گئی ہے ایسے دشمن کے ساتھ جو صبح کے وقت حملہ کرتا ہے اور صبح کا وقت بھی اپنے ضمن میں غلبہ کا معنی لیے ہوئے ہوتا ہے

﴿اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ﴾

(اگر تم پھل توڑنا چاہتے ہو) اگر تم اسے کاٹنے والے ہو

﴿فَانْطَلَقُوْا وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ﴾

(سو وہ چل پڑے اور ایک دوسرے کو چپکے چپکے کہتے جاتے کہ) سو وہ چل پڑے اور آپس میں سرگوشیاں کرتے جاتے۔خَفِیَ،خَفِتَ،اور خَفَدَ تینوں ''کتم'' کے معنی میں ہیں اور اسی سے خفدود، ہے جو چمگاڈر کے لے استعمال ہوتا ہے

﴿اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِيْنٌ﴾

(خبردار!)اس باغ میں ہرگز داخل نہ آج تم پر کوئی مسکین)''ان''مفسرہ ہے(کیونکہ ''يَتَخَافَتُوْن'' قول کے معنی میں ہے)

''أن'' کے مفسرہ ہونے کی مندرجہ ذیل تین صورتیں ہیں

(۱)''أن'' سے پہلے بھی جملہ ہو اور مابعد بھی جملہ ہو (۲)''أن'' سے پہلے کوئی حرف جار نہ ہو

(۳)اس سے پہلے کوئی ایسا فعل ہو جس میں قول کا معنی پایا جاتا ہو لیکن وہ بذات خود "قال" نہ ہو جبکہ زمخشری کے نزدیک اگر "قال" خود بھی ہو تو "أن" مفسرہ بن جاتا ہے

اور قول کے مضمر ہونے کی وجہ سے "ان" کے بغیر بھی پڑھا گیا ہے

(اس صورت میں یہ جملہ مقولہ ہوگا اور قول محذوف ہوگا عبارت یوں ہوگی "قالو ا لا ید خلنها الیوم علیکم مسکین ") اور دخولِ مسکین کی نھی سے مراد دخولِ مسکین کو ممکن بنانے سے نھی میں مبالغہ مراد ہے۔

(یعنی مساکین کو عطیہ دینا تو دور کی بات ہے ان کے دخول باغ کو ممکن ہی نہ بنایا جائے)

جس طرح کسی کا دوسرے کو یہ کہنا کہ "میں یہاں تمیں ہرگز نہ دیکھو"

﴿ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِیْنَ ﴾

(اور تڑکے تڑکے چلے (یہ سمجھتے ہوئے) کہ وہ اس ارادہ پر قادر ہیں) وہ صبح سویرے چلے دراں حالیکہ وہ مساکین کو نقصان/تنگی پہنچانے پر قادر تھے نہ کہ کسی اور چیز پر، یہ "حاردتِ السنة " سے مشتق ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جس سال بارش نہ برسے۔اور "حاردتِ الابل" اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی اپنی کھیری کو روک لے یعنی دودھ نہ دئے اور معنی یہ ہوگا کہ انہوں نے مساکین پر تنگی لانے کا عزم کیا پس ان پر تنگی آ گئی اس طرح کہ سوائے محرومی کہ وہ باغ میں کسی چیز پر قادر نہ تھے یا معنی یہ ہوگا کہ وہ صبح سویرے نکلے دراں حالیکہ وہ نفع حاصل کرنے پر قدرت رکھنے کی بجائے ناکامی اور محرومی کو حاصل کرنے والے تھے۔اور کہا گیا ہے کہ حَرْد ،حَرَدَ کے معنی میں ہے اور غدوا علی حَرَدٍ پڑھا بھی گیا ہے یعنی انہوں نے قدرت نہ رکھی مگر یہ کہ بعض بعضوں کو کوسنے لگے جس طرح اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے یتلاومون "وہ ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے" اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حرد کا معنی جلدی کرنا/قصد کرنا ہے اور کسی شاعر نے کہا

سیلاب اللہ کے حکم سے آیا
دراں حالیکہ وہ گھنے باغ کا قصد کر رہا تھا

یعنی وہ صبح سویرے جلدی جلدی اپنے باغ کی طرف چلے دراں حالیکہ وہ اس کی کٹائی پر قادر تھے۔کہا گیا ہے کہ حَرْد اس باغ کا نام تھا

﴿ فَلَمَّا رَاَوْهَا ﴾

(پھر جب باغ کو دیکھا) پہلے جس نے باغ کو دیکھا/دیکھنے والوں میں سے پہلے جس نے پہلے دیکھا

﴿ قَالُوْۤا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ﴾

(تو کہنے لگے (غالبا) ہم راستہ بھول گئے) اپنے باغ کا اور یہ وہ نہیں ہے (یہ ہمارا باغ نہیں ہے) (طریق جنتنا:لَضَآلُّوْن کا مفعول ہے)

﴿ بَلْ ﴾

(نہیں نہیں) غور و فکر کرنے کے بعد اور یہ جان لینے کے بعد کہ یہ ہمارا باغ نہیں ہے انہوں نے کہا "نہیں نہیں"

﴿ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴾

(ہماری تو قسمت پھوٹ گئی) ہمیں اپنی جانوں پر ظلم کے باعث اس باغ کی خیر سے محروم کر دیا گیا ہے

﴿ قَالَ اَوْسَطُهُمْ ﴾

(ان میں جو زیرک تھا بول اٹھا) رائے رضی اللہ عنہ پختگی کے اعتبار سے یا عمر کے اعتبار سے رضی اللہ عنہ بول اُٹھا

﴿ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴾

(کہ کیا میں تمہیں کہتا نہیں تھا کہ تم اس کی تسبیح کیوں نہیں کرتے)

'یعنی' اللہ کا ذکر کیوں نہیں کرتے اور اپنی نیت خبث (نیتوں کی خباثت) سے اس کی بارگاہ میں توبہ کیوں نہیں کرتے؟ اور یہ بات یقیناً اس نے ان سے اس وقت کہی جب انہوں نے مساکین کو محروم کرنے کا عزم کیا اور اس معنی پر دلالت کرنے والا فرمان الہی کرتا ہے

﴿ قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾

(کہنے لگے پاک ہے ہمارا رب' بے شک ہم ہی ظالم تھے) یا تم انشاء اللہ کیوں نہیں کہتے

سوال: جواب: (سوال)

تسبیح کو استثناء کا نام کیوں دیا گیا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

تعظیم میں ان دونوں کے شریک ہونے کی وجہ سے انشاء اللہ کو تسبیح کا نام دیا گیا ہے (جواب دوئم) استثناء کو تسبیح کا نام دیا گیا ہے اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز سے منزہ ہے کہ اس کی ملک/ملکیت میں ایسی چیز جاری ہو جس کا اس نے ارادہ نہ فرمایا ہو

﴿ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُوْنَ﴾

(پھر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے) بعض بعضوں کو ملامت کرنے لگے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جس نے اس بات کی طرف اشارہ کیا مساکین کو محروم کر دیا جائے ان میں سے ایک وہ تھا جس نیا س محروم کرنے کے عمل کو اچھا گمان کیا اور ان میں سے ایک وہ تھا جو رضا مندی کا اظہار کرتے ہوئے خاموش رہا اور ان میں سے ایک ایسا تھا جس نے اس عمل کو ناپسند کیا

﴿ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ﴾

(کہنے لگے تُف ہے ہم پر ہم ہی سرکش تھے) وہ اللہ کی حدوں کو تجاوز کرنے والے ہیں

﴿ عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ﴾

(امید ہے کہ ہمارا رب ہمیں (اس کا) بدلہ دے گا جو بہتر ہوگا) توبہ کی برکت اور گناہ کا اعتراف کرنے کی وجہ سے۔ روایت کیا گیا ہے کہ انہیں اس سے بہتر بدلہ دیا گیا اور اسے "يُبْدِلَنَا" تخفیف کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے (یعنی باب افعال سے)

﴿اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ﴾

(اس سے ہم (اب) اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے ہیں) معافی کی امید کرنے والے، بھلائی طلب کرنے والے ہیں

سوال: جواب: (سوال)

"رغب" کا صلہ "فی" ہے جبکہ یہاں "الی" کے ساتھ کیوں مذکورہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

الی کو انتہاءِ رغبت کے لیے ہے (یعنی "رغب" رجاء، امید، اور طلب کے معنی میں ہے)

(جواب دوئم)

"رغب" رجوع کے معنی کو متضمن ہے

﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ﴾

((دیکھ لیا) ایسا ہوتا ہے عذاب) جس عذاب کے ساتھ ہم نے اہل مکہ اور باغ والوں کو آزمایا اسی جیسا عذاب دنیا میں ہوتا ہے

﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ﴾

(اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے) اس عذاب کے عذاب سے بہت بڑا ہے

﴿ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴾

(کاش! یہ لوگ جانتے) ایسے کاموں سے اجتناب کرتے جوانہیں عذاب کی طرف لے جاتے ہیں (امام بیضاوی "لاحترزو عما یؤدیهم الی العذاب" کی عبارت سے اس جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ " لو کان یعلمون" شرط ہے اور "لاحترزو عما یؤدیهم الی العذاب" جواب شرط/ جزاء ہے)

(" لو " کو "لیت" کے معنی میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے اس صورت میں معنہ ہوگا '' کاش وہ جان لیتے '')

سوال: جواب: (سوال)

"یعلمون" فعل متعدی ہے پھر اس کا مفعول ذکر کیوں نہیں فرمایا گیا؟

(جواب) کبھی کبھی فعل متعدی کے مفعول کو حذف کر کے اس کو لازم کے قائم مقام بنادیا جاتا ہے اس وقت فعل کا تعلق صرف فاعل سے ہی ہوتا ہے اور مفعول بہ کی ضرورت نہیں رہتی)

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ﴾

(بیشک پرہیزگاروں کے لیے اپنے رب کے پاس) آخرت میں یا جوار قدس میں

(اللہ تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس لیے جہاں بھی "عند" وغیرہ کے الفاظ مذکور ہو وہاں سیاق کے مطابق ترجمہ کیا جاتا ہے)

﴿ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾

(نعمت بھری جنتیں (ہیں)) ایسی جنتیں ہیں جن میں خالص خوشحالی ہی ہے

﴿ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴾

(کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں گے) یہ کفار کے قول کا انکار ہے

کفار کہا کرتے تھے کہ اگر یہ بات صحیح ہو بھی جائے کہ ہمیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا جیسا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور جو ان کے ساتھی ہیں گمان کرتے ہیں تو بھی ہم پر کسی کو کوئی فضیلت نہیں بخشی جائے گی بلکہ ہم سے اچھی حالت میں ہوگئے، جیسا کہ ہم دنیا میں ہیں

﴿ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴾

(تمہیں کیا ہوگیا۔ تم کیسے فیصلے کرتے ہو) اس میں التفات ہے

التفات ایک ایسی اصطلاح ہے جس میں غائب کے صیغہ کو مخاطب اور مخاطب کو متکلم کی طرف اور متکلم کو غائب کی طرف پھیرا جاتا ہے،

سوال: جواب: (سوال)

یہاں کفار سے سوال کیا جارہا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جاننے والا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

(یہاں استفہام اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں بلکہ تعجب کے لیے ہے)

کفار کے اس فیصلہ پر تعجب ہے اور اس کو انتہائی بعید قرار دینا ہے اور اس چیز کا شعور دلانا ہے کہ ایسے بے سروپا فیصلے۔ فکر کی کج روی اور رائے کے ٹیڑھے پن کی وجہ سے صادر ہوتے ہیں

﴿ اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ فِيْهِ ﴾

(کیاتمہارے پاس کوئی کتاب ہے) آسمان سے نازل کردہ

﴿تَدْرُسُوْنَ﴾

(جس میں تم یہ پڑھتے ہو) جس میں تم پڑھتے ہو

﴿اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْنَ﴾

(تمہارے لیے اس میں ایسی چیزیں ہیں جن کو تم پسند کرتے ہو)

تمہارے لیے اس میں ایسی اشیاء/ چیزیں ہیں جن کو تم اختیار کرتے ہو اور جن کی تم خواہش کرتے ہو "اِنَّ" کی اصل " أَنَّ لکم" فتح کے ساتھ ہے، کیونکہ مفعول بہ ہے

سوال: جواب: (سوال)

" اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ لَمَا تَخَيَّرُوْن' ترکیبی اعتبار سے 'تدرسون" کا مفعول بہ ہے اور "اِنَّ" درمیان کلام میں " أَنَّ" پڑھا جاتا ہے اور نہ ہی " أَنَّ" کی خبر پر لام تاکید آتا ہے تو پھر " أَنَّ" کو "اِنَّ" کیوں پڑھا گیا ہے؟

(جواب اول)

پس جب اس لام کے ساتھ لایا گیا تو اسے کسرہ دے دیا (یعنی یہ) " أَنَّ" ہی تھا تو چونکہ " أَنَّ" کی خبر پر لام تاکید/مفتوح نہیں آتا اس لیے جب " أَنَّ" کی خبر پر لام تاکید/مفتوح آیا تو یہ "اِنَّ" بن گے

(جواب ثانی)

اور یہ بھی جائز ہے کہ جس کلام کو وہ پڑھا کرتے تھے اسی کو ہی بیان کرنا ہو (یعنی اعراب حکائی ہو جیسے کتاب میں مذکور تھا بعینہ ہی اسی طرح یہاں ذکر کر دیا گیا

(جواب ثالث)

یا یہ جملہ مستانفہ ہو تخیر الشیء و اختاره کا مطلب ہے کسی شئی کی اچھائی/عمدگی کو حاصل کر لینا

﴿اَمْ لَكُمْ اَيْمَانٌ عَلَيْنَا﴾

(کیا تمہارے لیے قسمیں ہم پر (لازم) ہیں) ایسے وعدے جنہیں قسموں کے ساتھ مؤکد کیا گیا ہے؟

﴿بَالِغَةٌ﴾

(جو باقی رہنے والی ہیں) یعنی قسمیں جو توکید میں انتہاء کو پہنچنے والی ہو اور "بَالِغَةٌ" کو حال ہونے کی وجہ سے منصوب بھی پڑھا گیا ہے (سوال) اگر "بَالِغَة' حال ہو تو حال کے لیے ایک عامل کا ہونا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں عامل کون ہے؟ (جواب) حال میں عامل دونوں ظرفوں میں سے ایک ہے

پہلا ظرف: لکم دوسرا ظرف: علینا

یعنی جس شبہ فعل کے متعلق لکم/علینا ہوگا اسی شبہ فعل کی ضمیر سے حال واقع ہوگا

﴿اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ﴾

(قیامت تک) لکم میں جس (شبہ فعل) کو مقدر مانا گیا ہے " اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ" بھی اسی کے متعلق ہے

یعنی معنی ہوگا یعنی قسمیں تمہارے لیے ہم پر قیامت تک ثابت ہیں کہ ہم ذمہ داری سے عہدہ برا نہیں ہوگئے یہاں تک کہ قیامت کے دن تمہارے لیے کوئی "حَكَم" (فیصلہ کرنے والا) بنا دے؟ یا " اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ"، "بالغة" یعنی فعل یعنی کے متعلق ہوگا یعنی معنی ہوگا کہ یعنی قسمیں قیامت تک پہنچنے والی ہیں

﴿اِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُوْنَ﴾

(کہ تمہیں وہی ملے گا جو تم حکم کرو گے) یہ جواب قسم ہے، کیونکہ معنی یہ ہے کہ کیا ہم پر تمہارے لیے کوئی قسمیں ہیں یا ہم نے تمہارے لیے قسمیں اُٹھا رکھی ہیں؟

﴿سَلْهُمْ اَيُّهُمْ بِذٰلِكَ زَعِيْمٌ﴾

(ان سے پوچھیے ان میں سے کون ان (بے سروپا) باتوں کا ضامن ہے) جو اس حکم کا دعوی کرے اور اس ﷺ سر و پا باتوں ﷺ کی تصیح کرے

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ﴾

(کیا ان کے پاس کوئی گواہ ہیں) جو ان کے ساتھ اس قول میں شریک ہوتے ہیں

﴿فَلْيَاْتُوْا بِشُرَكَآئِهِمْ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ﴾

(اگر ہیں تو پھر پیش کریں اپنے گواہوں کو اگر وہ سچے ہیں)

اپنے دعویٰ میں کیونکہ تقلید سے کم کوئی درجہ نہیں اللہ تعالیٰ نے ان آیات بینات میں تنبیہ فرمائی ہے ان تمام چیزوں کی نفی پر جن کے ساتھ ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ عقلی یا نقلی دلیل پکڑ سکیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہو کہ وہ استحقاق کی وجہ سے دعوی کرنے کا حق رکھتے ہیں یا کسی وعدہ کی وجہ سے ﷺ کرنے کا حق رکھتے ہیں ﷺ راتب نظر پر تنبیہ فرماتے ہوئے اور اس چیز کو باطل کرتے ہوئے جس کی کوئی سند نہ ہو ﷺ تمام ذرائع کی نفی فرمادی ﷺ ور کہا گیا ہے کہ معنی یہ ہوگا کیا آخرت میں ان کے لیے ایسے ساتھی ہیں جو ان کو مؤمنین کی مثل بنادیں گے؟ گویا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نفی فرمادی کہ تسویہ اللہ کی طرف سے ہو تو اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی نفی فرمادی کہ یہ برابری کسی ایسی چیز کے ساتھ ہو جسے وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھراتے ہیں

(یعنی اللہ تعالیٰ تو ان دو گرہوں کے درمیان مساوات نہیں فرمائے گا تو ان کے معبود باطلہ بھی اس بات کی طاقت نہیں رکھیں گے جنھیں وہ اللہ کے ساتھ شریک ٹھراتے ہیں) (تسویہ: برابری)

نظر و فکر کے تین طریقے ہیں

1: عقلی دلیل کے ساتھ　　2: نقلی دلیل کے ساتھ　　3: اجتہاد یعنی تقلید کے ساتھ

ﷺ تمام ذرائع کی نفی فرمادی ﷺ

سوال: جواب: (سوال)

امام صاحب نے "عقل او نقل" کے بعد فعل "یدل" واحد ذکر کیا جبکہ چاہیے تو یہ تھا کہ فعل تثنیہ "یدلان" ذکر کرتے اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اگر زیادہ اشیاء ہو اور ان کا عطف کلمہ "أو" کیساتھ ہو تو ان سب کی طرف واحد کی ضمیر لوٹانا بھی جائز ہے

﴿يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ﴾

(جس روز پردہ اُٹھایا جائے گا ایک ساق سے تو) (اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں)

(پہلا معنی)

جس دن معاملہ شدید ہوگا اور مصیبت سخت ہوگئی۔ یہ ضرب المثل ہے

اس کی اصل یہ ہے کہ دورانِ جنگ پردہ دار عورتوں کا اپنی پنڈلی سے کپڑا اُٹھا کر بھاگنا ہے

حاتم نے کہا

اے جنگ کے بھائی !(اے جنگجو!) اگر جنگ اسے کاٹے تو وہ اسے کاٹتا ہے

اور اگر وہ اپنی پنڈلی عریاں کرے تو وہ بھیاپنی پنڈلی عریاں کرتا ہے

(دوسرا معنی)

یا جس دن معاملہ کی اصل اور اس کی حقیقت سے پردہ اُٹھایا جائے گا اس طرح کہ (معاملہ) عیاں ہو جائے گا،

سوال: جواب: (سوال)

"ساق" سے معاملہ کی حقیقت مراد لینا کیسے درست ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

یہ ساق الشجرہ اور ساق الانسان س ے مستعار لیا گیا ہے۔ اور "ساق" کو نکرہ ذکر کرنا معاملہ کی خوفنا کی یا اس کی عظمت بیان کرنے کے لیے ہے۔ "یُکْشَف" کو " تَکْشِفُ /تُکْشَفُ "معروف/مجہول کہ صورت میں "ت" کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔ معروف/مجہول دونوں صورتوں میں فعل ساعت/حالت کے لیے ہوگا (یعنی ضمیر محذوف یا تو ساعت/حالت کی طرف راجع ہوگئی/فاعل/نائب الفاعل "الساعة/الحالة" محذوف ہوگا)

﴿وَّ یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾

(ان (نابکاروں) کو سجدہ کہ دعوت دی جائے گی) اگر یوم سے مراد یوم قیامت ہوتو ان کو ترک سجود پر زجر وتوبیخ کرنا ہے یا اگر یوم سے مراد وقت نزع ہو ہے انہیں وقتی نماز کے لیے بلایا جاتا ہے

﴿فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ﴾

(تو اس وقت وہ سجدہ نہ کر سکیں گے) وقت کے گزر جانے کے باعث یا سجدہ پر قدرت کے زائل/ختم ہو جانے کی وجہ سے (اگر یوم سے مراد یوم قیامت ہوتو وہ سجدہ کی قدرت نہیں رکھے گے کیونکہ سجدہ کا وقت ختم ہو چکا ہوگا اور اگر یوم سے مراد وقت نزع ہوتو وہ سجدہ کی طاقت نہیں رکھے گئے کیونکہ ان کی طاقت/قدرت ختم ہو چکی ہوگئی)

﴿خَاشِعَةً اَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ﴾

(ندامت سے جھکی ہونگی ان کی آنکھیں ان پر ذلت چھا رہی ہوگئی) ذلت ان کو لاحق ہو رہی ہوگئی

﴿وَقَدْ كَانُوْا یُدْعَوْنَ اِلَی السُّجُوْدِ﴾

(حالانکہ انہیں دنیا میں بلایا جاتا تھا سجدے کی طرف) دنیا میں یا صحت ِ زمانہ میں

﴿وَهُمْ سَالِمُوْنَ﴾

(جبکہ ہو صحیح سلامت تھے) دنیا میں ممکن بنانے والے تھے اور بیماریوں سے دور تھے

﴿فَذَرْنِیْ وَمَنْ یُّكَذِّبُ بِهٰذَا الْحَدِیْثِ﴾

(پس (اے حبیب) آپ چھوڑ دیجیے مجھے اور اسے جو اس کتاب کو جھٹلاتا ہے)

آپ ﷺ اسے میرے سپرد فرما دیں بے شک میں آپ ﷺ کی طرف اس کا فی ہو (كِلْــــــهُ: كِلْ : فعل امر ہے)

﴿سَنَسْتَدْرِجُهُمْ﴾

(ہم انہیں بتدریج تباہی کی طرف لے جائے گئے) ہم نعمتوں کی فراوانی، دائمی صحت، اور مہلت دینے کے ساتھ انہیں درجہ بدرجہ عذاب کے قریب لے جائے گے

﴿مِّنْ حَیْثُ لَا یَعْلَمُوْنَ﴾

(اس طرح کہ انہیں علم تک نہ ہوگا) کہ یہ استدراج ہے("انه استدراج" سے اس جانب اشارہ ہے کہ "یعلمون" فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول "انه استدراج" محذوف ہے) یہ ان پر ظاہری انعام فرمانا ہے کیونکہ انہوں نے مومنین پر اس انعام کو اپنے لیے فضیلت گمان کیا تھا

(استدراج کیا ہے؟

اگر کسی کافر کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف عادت رونما ہو تو اسے " استدراج" کہتے ہیں

اگر نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف معمول واقع ہو تو اسے "اهانت" کہتے ہیں

اگر کسی ولی کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف عادت رونما ہو تو اسے "کرامت" کہتے ہیں

اگر کسی مومن کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف معمول واقع ہو تو اسے "اعانت" کہتے ہیں

اگر نبوت سے قبل کسی نبی کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف عادت رونما ہو تو اسے " ارباص" کہتے ہیں

اگر کسی نبی کے ہاتھ پر کوئی بات خلاف معمول واقع ہو تو اسے "معجزہ" کہتے ہیں

﴿وَاُمۡلِیۡ لَهُمۡ﴾

(اور میں نے (سرِ دست) انہیں مہلت دے رکھی ہے) میں انہیں مہلت دیتا ہوں (املی یملی: مہلت دینا/ اِملا کروانا)

﴿اِنَّ کَیۡدِیۡ مَتِیۡنٌ﴾

(میری تدبیر بڑی پختہ ہے) اسے کسی چیز کے ساتھ دور نہیں کیا جا سکتا ہے/ ٹالا نہیں جا سکتا۔ اور اللہ تعالی نے انعام کو "کید" کے ساتھ "استدراج" کا نام دیا ہے کیونکہ "استدراج" کید تو نہیں مگر کید کی ایک صورت ہے

﴿اَمۡ تَسۡـَٔلُهُمۡ اَجۡرًا﴾

(آیا آپ ان سے کچھ اجرت مانگتے ہیں) راہ نمائی کرنے پر

﴿فَهُمۡ مِّنۡ مَّغۡرَمٍ﴾

(پس وہ اس تاوان (کے بوجھ) سے) کسی جرمانہ/ چٹی بوجھ سے

﴿مُّثۡقَلُوۡنَ﴾

(دبے جاتے ہیں) پس وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اعراض کہتے ہیں

﴿اَمۡ عِنۡدَهُمُ الۡغَیۡبُ﴾

(کیا ان کے پاس غیب کی خبر آتی ہے) لوح یا غیب کی خبریں

﴿فَهُمۡ یَکۡتُبُوۡنَ﴾

(اور وہ اس کو لکھ لیتے ہیں) جس سے وہ فیصلہ کرتے ہیں، اور اس لوح کے علم کی وجہ سے وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم سے مستغنی ہو گئے ہیں

﴿فَاصۡبِرۡ لِحُکۡمِ رَبِّکَ﴾

(پس آپ انتظار فرمائیے اپنے رب کے حکم کا) یہ انھیں مہلت دینا ہے اور ان پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح کو مؤخر کرنا ہے ﴿وَلَا تَکُنۡ کَصَاحِبِ الۡحُوۡتِ﴾

(اور نہ ہو جائیے مچھلی والے کی مانند) حضرت یونس علیہ السلام ہے ہیں کہ " صاحب حوت" سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں

﴿اِذۡ نَادٰی﴾

(جب اس نے پکارا) مچھلی کے پیٹ میں

﴿وَهُوَ مَكۡظُومٌ﴾

(اور وہ غم واندوہ سے بھرا ہوا تھا) وہ غصے سے بھرے ہوئے تھے

﴿لَوۡلَآ اَنۡ تَدٰرَكَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ﴾

(اگر اس کی چارہ سازی نہ کرتا اس کے رب کا لطف) اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم صبر نہ فرماتے اور جلدی کو اپناتے تو جیسے حضرت یونس علیہ السلام نے کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو آزمائش میں مبتلا کر دیا جاتا

فتبتلی: "ف" سببیہ ہے اس کے بعد "أنْ" مقدرہ ہے عبارت یوں ہوگی (ان لم تصبر و عجلت کما عجل یونس علیہ السلام فتبتلی کماابتلی یونس علیہ السلام)

﴿لَوۡلَآ اَنۡ تَدٰرَكَهٗ نِعۡمَةٌ مِّنۡ رَّبِّهٖ﴾

(اگر اس کی چارہ سازی نہ کرتا اس کے رب کا لطف) یعنی توبہ کی توفیق بخشی اور اسے قبول فرمایا۔ فعل کو مؤنث ذکر کرنا فاصلہ کی وجہ سے اچھا ہے اور تدارکہ کو تدارکتہ یعنی تتدارکتہ " حکایت حال ماضیہ کے طریقہ پر" لو لا ان کان یقال فیه تتدارکه کے معنی میں بھی پڑھا گیا ہے

سوال: جواب: (سوال)

حکایت حال ماضیہ سے کیا مراد ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

جب کوئی کام گزشتہ زمانہ میں وقوع پذیر ہو چکا تو بعض اوقات بیان کرنے والا واقعہ کو دلچسپ بنانے کے لیے اس کو مضارع کے ساتھ بیان کرتا ہے جیسے میں جنگل میں جا رہا تھا کہ اچانک شیر آ گیا، اور میں نے تیر چلایا وغیرہ

﴿لَنُبِذَ بِالۡعَرَآءِ﴾

(تو ڈال دیا جاتا اسے چٹیل میدان میں) درختوں سے خالی زمین پر/ ایسی زمین پر جو درختوں سے خالی ہوتی

﴿وَهُوَ مَذۡمُوۡمٌ﴾

(دراں حال کہ اس کی مذمت کی جاتی) ان کی ملامت کی جاتی، رحمت و شرف/ بزرگی سے دور کر دیا جاتا

یہ جملہ ترکیب کلام میں حال واقع ہو رہا ہے جس پر جوابِ لولا کا اعتماد کیا گیا ہے کیوں کہ نفی مذمت کی کی جا رہی ہے نہ کہ " نبذ" کی

﴿فَاجۡتَبٰهُ رَبُّهٗ﴾

(پھر چن لیا اس کو اس کے رب نے) ان پر وحی لوٹانے کے ساتھ یا نبوت عطا کرنے کے ساتھ اگر یہ صحیح ہو کہ وہ اس واقعہ سے قبل نبی نہیں تھے (استنباء ہ: سے پہلے "ان" ناصبہ مقدر ہے)

﴿فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ﴾

(اور بنا دیا اس کو اپنے نیک بندوں سے) نیک بندوں میں سے وہ لوگ جو نیکی کرنے میں کمال درجہ پر فائز ہیں اللہ تعالی نے حضرت یونس علیہ السلام کو محفوظ کر لیا ان افعال سے جن کا ترک کرنا اولی ہے۔ اور اس میں بندوں کے افعال کی تخلیق پر دلیل ہے اور یہ آیۃ کریمہ فَاصۡبِرۡ لِحُكۡمِ رَبِّكَ اس وقت نازل ہوئی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ بنو ثقیف کے لیے بدعا کرنے کا ارادہ فرمایا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جنگِ احد میں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر مصیبت نازل ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارادہ فرمایا کہ شکست خوردہ واپس پلٹنے والے مسلمانوں کے لیے بدعا فرمائے

﴿وَاِنۡ يَّكَادُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَيُزۡلِقُوۡنَكَ بِاَبۡصَارِهِمۡ﴾

(اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ کفار پھسلا دیں گے آپ کو اپنی (بد) نظروں سے) ان "مخففه من مثقله" ہے اور " لَيُزۡلِقُوۡنَكَ" کا لام اس کی دلیل

ہے ﷺ لام کو لام فارقہ بھی کہتے ہیں ﷺ" مکسورہ کا حالت تخفیف کی میں عمل کرنا اور نہ کرنا دونوں جائز ہیں عمل نہ کرنے کی صورت میں اس کی خبر پر لام تاکید کا ہونا ضروری کرے گا تاکہ اِنَّ میں اور ان نافیہ میں فرق ہو جائے جیسے ان عملك متقن /ان عمل مُتقن/لمتقن "

اور معنی یہ ہوگا کہ مشرکین اپنی عداوت کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ کی طرف ترشی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اس طرح کہ قریب ہے کہ وہ آپ ﷺ کے قدموں کو پھسلا دیں اور آپ ﷺ کو گرا دیں۔ یہ عربوں کے قول سے ماخوذ ہے کہ فلاں نے میری طرف دیکھا قریب تھا کہ وہ مجھے ہلاک کر دیتا ،یعنی اگر نظر سے گرانا ممکن ہوتا تو وہ ایسا کر گزرتا یعنی قریب ہے کہ مشرکین آپ ﷺ کو نظر لگا دیتے کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ **بنو اسد** میں نظر لگانے والے لوگ موجود تھے ان کے کچھ لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ رسول ﷺ کو نظر بد لگا دئے پس یہ آیت نازل ہوئی اور حدیث مبارکہ میں آیا ہے کہ نظر (بد) انسان کو قبر میں داخل کر دیتی ہے اور اُونٹ کو ہنڈیا میں داخل کر دیتی ہے۔شاید کہ نظر لگانا بعض نفوس کی خصوصیات ہیں نافع مدنی نے لَیُزْ لِقُوْنَکَ کو لَیَزْ لِقُوْنَکَ پڑھا ہے یہ زَلَقْتُه فَزَلَقَ سے ماخوذ ہے معنی یہ ہے کہ میں انے اسے پھسلایا پس وہ پھسل گیا جیسے میں نے اسے غمگین کیا پس وہ غمزدہ ہو گیا اور لَیُزْ لِقُوْنَك کو لَیُزْ ھِقُوْنَکَ بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ آپ کو ہلاک کر دئے گئے

﴿ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ ﴾

(جب وہ سنتے ہیں قرآن) قرآن کی سماعت کے وقت ان کا حسد و بغض ظاہر ہو جاتا ہے

﴿ وَيَقُوْلُوْنَ اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴾

(اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو مجنون ہے) حضور ﷺ کے معاملہ پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے اور اس کو ناپسند کرتے ہوئے

﴿وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ﴾

(حالانکہ وہ نہیں مگر سارے جہانوں کے لیے وجہِ عزّ وشرف) جب مشرکین نے حضور ﷺ کو قرآن کی وجہ سے مجنوہ قرار دیا تو اللہ تعالیٰ نے بیان فرما دیا کہ قرآن ایسا ذکر عام ہے جس تک رسائی وہی شخص حاصل کر سکتا ہے جو از روئے عقل لوگوں سے اکمل ﷺ ترین/مکمل عقل والا ﷺ راز روئے رائے کے پختہ ہو

سورۃ نمبر	سورہ الملك	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات

﴿اَلْحَآقَّةُ﴾

(ہو کر رہنے والی ہے) یعنی ساعت (گھڑی) یا ایسی حالت جسکا واقع ہونا برحق ہے یا ایسی (حالت) جس میں امور متحقق ہونگے یعنی ان امور کی حقیقت کو جانا جائے گا یا اس حالت میں حساب و جزا کے بڑے بڑے امور واقع ہونگے اس صورت میں اسناد مجازی کے طریقہ پر فعل کی نسبت حالت کی طرف کی گئی ہے (یعنی حالت واقع نہیں ہوگئی بلکہ جزاء و سزا کے امور واقع ہونگے۔ یہاں مجاز مرسل ہے علاقہ محلیت کا ہے حال بول کر محل مراد لیا گیا ہے) (جب فعل یا شبہ فعل کی نسبت اس کے فاعل حقیقی کی طرف نہ کی جائے بلکہ اس کے زماں، مکان یا اس کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف کی جائے تو اسے مجاز مرسل کہتے ہیں)

(**الحاقه** سے مراد قیامت ہے۔الحاقه واحد مؤنث اسم فاعل کا صیغہ ہے جو حَقَّ یَحِقُ سے صفت واقع ہوا ہے۔ حقّ کا معنی ہے کسی چیز کا متحقق ہو جانا ۔ پایا جانا قیامت کو **الحاقه** کہنے کی متعدد وجوہات ہیں۔ یا تو اس لیے کہ اس کا پایا جانا ایک مسلمہ صداقت ہے اور اٹل حقیقت ہے جس میں قطعاً کوئی شک نہیں یا اس لیے کہ اس میں تمام تصفیہ امور کی حقیقت آشکار ہو جائے گی یا اس لیے کہ اس روز سزا و جزا کا تحقق ہوگا (مظہری)

(الحاقه کے بارے میں امام بیضاوی نے یہاں تین احتمالات ذکر کئے ہیں

1: الحاقه صفت ہے اس سے پہلے موصوف محذوف ہے جو کہ الساعة ہے یا الحالة ہے، اس صورت میں اسناد حقیقی ہوگئی

2: الحاقه اسم فاعل کا صیغہ ہے اس صورت میں اسناد مجازی ہوگئی فعل کی نسبت اس کے ظرف کی طرف کی گئی ہے

3: اس صورت اسناد مجازی ہے اس صورت میں فعل کی نسبت الساعة یا الحالة کی طرف کی گئی ہے (الحاقة) یہ مبتدا ہے اور

﴿مَالْحَآقَّةُ﴾

﴿کیا ہے وہ ہو کر رہنے والی﴾ اس کی خبر ہے (ما) استفہامیہ مبتدا اور الحاقہ اس کی خبر، مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ ہو کر پہلے مبتدا'' الحاقه '' کی خبر، مبتدا خبر ملکر جملہ اسمیہ ہوا)

(سوال) سوال: جواب:

جب جملہ صفت یا خبر واقعہ ہو تو اس میں ایک ایسی ضمیر کا ہونا ضروری ہے جو مبتدا یا موصوف کی طرف لوٹے پھر یہاں ضمیر موجود کیوں نہیں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

ضمیر کا ہونا ضروری نہیں ہوتا بلکہ ایک رابطہ کا ہونا ضروری ہوتا ہے تو یہاں مبتدا کو بعینہ ذکر کر دیا گیا ہے اور جہاں مبتدا کو بعینہ ذکر کر دیا جائے وہاں ضمیر کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کی اصل ما هی ہے یعنی یہ کون سی چیز ہے اور استفہام کو اس کی عظمت و ہولنا کی کو بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ اسم ظاہر کو اسم ضمیر کی جگہ رکھا گیا ہے کیونکہ یہ اس کے لیے زیادہ ہولناک ہے

(بعض اوقات جب اسم ظاہر کو دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے تو وہ تعظیم کا معنیٰ دیتا ہے اگر ضمیر کو ذکر کرتے تو اس سے وہ معنیٰ حاصل نہ ہوتا)

﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَالْحَآقَّةُ﴾

﴿اور اے مخاطب تم کیا سمجھو وہ ہو کر رہنے والی کیا ہے﴾ تجھے کس چیز نے علم دیا کہ یہ کیا ہے یعنی اے مخاطب! تم اس کی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ پس یہ (قیامت) عظیم ہے کہ کسی ایک کی درایت (عقل) اس (کے علم) تک پہنچے۔ ما مبتدا اور ادراك اس کی خبر ہے (ادری یدری تین مفعولوں کو نصب دیتا ہے ، درایة: اپنے اٹکل پچو سے خود جاننے کی کوشش کرنا)

﴿كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌم بِالْقَارِعَةِ﴾

﴿جھٹلایا عاد و ثمود نے ٹکرا کر پاش پاش کرنے والی کو﴾ ایسی حالت کو جو لوگوں کو ٹکرائے گئی ڈرانے کے ساتھ اور اجرام فلکی کو ٹکرائے گئی آسمان کے پھٹنے کے ساتھ اور ستاروں کے بکھرنے کے ساتھ۔ قارعه کی ضمیر کو حاقه کی جگہ رکھا گیا ہے

(سوال ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کیا؟ تو مفعول لہ کی صورت میں اس کا جواب دیا) اس کی شدت میں زیادتی کے لیے

(قرع یقرع : کھٹکھٹانا' ایک سخت چیز کو دوسری چیز سے ٹکرانا۔ القارعة صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ الف لام بمعنیٰ اللتی ہے) (القارعه: اس سے مراد بھی قیامت ہے۔ قیامت کے کئی نام ہیں الطامه، الصاخة، الواقعة، القارعة وغیرہ۔ یہ نام قیامت کی مختلف صفات اور کیفیات پر دلالت کرتے ہیں رضی اللہ عنہ ضیاء القرآن علیہ السلام)

﴿فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ﴾

﴿پس ثمود تو انھیں ہلاک کر دیا گیا سخت چنگھاڑنے کے ساتھ﴾ اس واقعہ ہونے والی کے ساتھ جو شدت میں حد سے تجاوز کرنے والی تھی اور وہ چنگار (کڑک) تھی یا زلزلہ تھا

(سوال)

سوال: جواب: ان اقوام کو کیوں ہلاک کیا گیا؟

سوال: جواب: (جواب)

ان اقوام کو قارعہ کی تکذیب کی وجہ سے ہلاک کر دیا گیا (اس صورت میں بالطاغیه والی ''ب'' استعانت کے لیے ہوگئی) یا قیامت کی تکذیب میں حد سے تجاوز کر جانے کی وجہ سے یا دوسرے کرتوتوں میں رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم تجاوز کر جانے کی وجہ سے۔ (اس سورت میں ''ب'' سببیت کے لیے ہوگئی) اس صورت میں یہ (الطاغیه) مصدر ہوگا جیسے عافیة اور (اس صورت میں یعنی جب 'ب' سبب کے لیے ہوگئی اور طاغیہ مصدر ہوگا تو) یہ اللہ کے اس قول کے مطابق نہیں ہوگا

﴿وَاَمَّا عَادٌ فَاُهۡلِكُوۡا بِرِيۡحٍ صَرۡصَرٍ﴾

[اور رہے عاد تو انھیں ہلاک کر دیا گیا آندھی سے جو سخت سرد،] یعنی وہ شدید آواز والی تھی یا سخت سرد تھی (پہلی صورت میں یہ) الصَرّ سے (دوسری صورت میں) الصِرّ سے ماخوذ ہے

﴿عَاتِيَةٍ﴾

[بے حد تُند تھی] تیز آندھیاں گویا کہ وہ (آندھیاں) اپنے دروغوں پر سرکش ہوئی پس انہوں نے اس کو ضبط کرنے کی اسطاعت نہ پائی یا (آندھیاں) قوم عاد پر سرکش ہوئی اور اور وہ لوگ اس کو لوٹانے پر قدرت نہیں رکھتے تھے (عَاتِيَة)

(عتا یعتو سے اسم فاعل ہے اس کا معنی ہے تکبر کرنا، حد سے تجاوز کرنا)

﴿سَخَّرَهَا عَلَيۡهِمۡ﴾

[اللہ نے مسلط کر دیا اسے] اللہ نے ان پر مسلط کر دیا اپنی قدرت کے ساتھ اور یہ

(جملہ) مستائنفه ہے یا یہ صفت ہے جسے لایا گیا ہے وہم کی نفی کے لیے لایا گیا ہے ﷺ کیا تعالیٰ یہ اتصالات فلکی کی وجہ سے ہوا ہے (اول تو یہ کہ ہم مانتے ہی نہیں کہ یہ اتصالات فلکیہ کی وجہ سے ہوا ہے) اگر مان لیا جائے تو بھی ان کو مقدر کرنے والا اور مسبب اللہ ہی ہے (یہاں کانت بمعنیٰ وُجِدَت ہے)

(سخر کا معنیٰ ہے کسی کو کسی کے ماتحت کر دینا اور اس کے دو معنیٰ ہیں 1 تسخیر رحمت 2 تسخیر عذاب)

﴿سَبۡعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوۡمًا﴾

[(مسلسل) سات رات اور آٹھ دن تک جو جڑوں سے اکھیڑنے والی تھی] لگاتار (حسوما) حاسم کی جمع ہے جو کہ حسمت الدابة سے ماخوذ ہے (یہ اس وقت بولا جاتا ہے) جب آپ مسلسل جانور کو داغتے ہیں

(''بین'' کا لفظ زائدہ ہے کیونکہ ''بین'' متعدد اشیاء کی طرف مضاف ہوتا ہے علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بین'' کا لفظ ذکر نہیں کیا یا اس بناء پر استعمال کیا گیا کہ بار بار داغنے کی وجہ سے)

(سات راتیں اور آٹھ دن) منحوس تھے (ان ایام) نے ہر بھلائی کو ختم کر دیا اور اسے جڑ سے اکھیڑ دیا یا اس کا معنی قاطعات ہے یعنی انہوں نے ان کی نسلوں (ان کی اصل) کو ختم کر دیا اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ قطعا کے معنی میں مصدر ہو جسے مفعول لہ ہونے کی بناء پر نصب دی گئی ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اپنے فعل مقدر کا مصدر ہو جو حال بن رہا ہو یعنی تحسمهم حسوما اور فتح کے ساتھ پڑھنا اس کی تائید کرتا ہے (یعنی حسوما فَعُول کے وزن پر مصدر ہے) اور یہ ایام عجوز کے دن تھے ایک بدھ کی صبح سے لیکر دوسرے بدھ کی شام تک اور انہیں ایام عجوز کا نام دیا گیا ہے کیونکہ یہ موسم سرما کے آخری ایام تھے یا اس وجہ سے انھیں ایام عجوز کا نام دیا گیا ہے کہ قوم عاد کی ایک بڑھیا تھی جو ایک غار میں چھپ گئی تھی (بالآخر) ہوا نے اٹھویں روز اس کو بھی ہلاک کر دیا

﴿ فَتَرَى الۡقَوۡمَ﴾ [تو تو دیکھتا قوم عاد کو ان دنوں] اگر تم ان حاضر ہوتے

﴿فِيۡهَا﴾

(''ھا'' ضمیر کے مرجع کے بارے میں بتا رہے ہیں) ہوا کی گزرگاہ میں یا اُن راتوں/ دنوں میں

﴿صَرۡعٰى﴾

[گرے پڑے ہیں] تو ان کو مرتے ہوئے دیکھتا۔ یہ (صرعی) صریع کی جمع ہے

﴿ كَاَنَّهُمۡ اَعۡجَازُ نَخۡلٍ ﴾

[گویا وہ ٹڈھ ہیں کھوکھلی کھجور] کھجوروں کی جڑ

﴿خَاوِیَة﴾

درمیان سے خالی

﴿فَهَلۡ تَرٰى لَهُمۡ مِّنۡۢ بَاقِیَةٍ﴾

﴿کیا تمہیں نظر آتا ہے ان کا کوئی باقی ماندہ فرد﴾ باقی رہا ہوا یا باقی ماندہ کوئی فرد یا ان کا باقی رہنا (باقیہ فعل کا مفعول بہ ہے''ب'' زائدہ برائے تاکید ہے)

(بقیة: اس سے بتا رہے ہیں کہ باقیہ اسم ہے جو کہ بقیہ کے معنی میں ہے)

(باقیة: اس سے بتا رہے ہیں کہ باقیہ صفت ہے جس کا موصوف نفس محذوف ہے)

(بقاء: اس سے بتا رہے ہیں کہ باقیہ، بقاء کے معنی میں ہے جو کہ مصدر ہے)

﴿وَجَآءَ فِرۡعَوۡنُ وَمَنۡ قَبۡلَهٗ﴾

﴿فرعون اور جو اس سے پہلے تھے﴾ جو اس سے پہلے گزرے۔ بصریان (ابوعمرو بن العلا البصری۔ یعقوب حضرمی بصری) اور امام الکسائی کوفی نے اسے و من قِبَله پڑھا ہے یعنی جو اس کے اطاعت کرنے والے اس کے پاس موجود تھے اور اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے **و من معه** پڑھا ہے

﴿وَالۡمُؤۡتَفِکٰت﴾

﴿اور الٹائی جانے والی بستیاں کے باشندوں نے﴾ قوم لوط کی بستیاں یعنی اہل بستی والوں (**المؤتفکات** :**مؤتفکة** کی جمع ہے جس کا معنی **المُنۡقَلِبه**۔ یعنی اُلٹے ہوئے) (**المؤتفکات** سے مراد قوم عاد کی پانچ بستیاں ہیں جن کے نام یہ ہیں

۞ سَدوم ۞ عَمُوۡرا ۞ ادمه 4 صَبُوۡیَیم 5 صَوغَر

﴿بِالۡخَاطِئَة﴾

﴿غلطی کا ارتکاب کیا﴾ خطاء سے اس جانب اشارہ ہے کہ خطاء اسم فاعل کے وزن پر مصدر ہے **بالفعله** سے اس جانب اشارہ ہے کہ خطاء صفت ہے اور اس کا موصوف **الفعله** ہے اور الافعال ذات الخطاء سے اس جانب اشارہ ہے کہ اسم فاعل کا صیغہ نسبت کے معنی میں ہے، ایسے افعال لائے جو خطاء والے تھیا **لخاطئه** :اگر ثلاثی مجرد ہو تو پھر اس کا معنی ہے''جان بوجھ کر غلطی کرنا'' اگر اس کا باب افعال بنایا جائے تو اس کا معنی ہے''بھولے سے غلطی کرنا)

(اموی کہتے ہیں **المُخطی** اسے کہتے ہیں جو نیکی کا ارادہ کرے لیکن اس سے غلطی ہو جائے اور''خاطی'' اسے کہتے ہیں جو جان بوجھ کر نا مناسب بات کا ارتکاب کرے، **الخاطئه** چونکہ مجرد ہے اس لیے اس کا معنی گناہ ہوگا۔ قرطبی لکھتے ہیں ا **لخاطئه :الذنب العظیم** بہت بڑا گناہ)

﴿فَعَصَوۡا رَسُوۡلَ رَبِّهِمۡ﴾

﴿پس انہوں نے نافرمانی کی اپنے رب کے رسولوں کی﴾

سوال: جواب: (سوال)

رسول کو مفرد کیوں ذکر کیا حالانکہ رسول تو بہت آئے؟

سوال: جواب: (جواب)

یعنی ہر امت نے اپنے رسول کی نافرمانی کی

﴿فَاَخَذَهُمۡ اَخۡذَةً رَّابِیَة﴾

﴿تو اللہ نے پکڑ لیا انہیں بڑی سختی سے﴾ (یہ پکڑ نا) شدت میں بہت زیادہ تھا اعمال کی قباحت میں زیادتی کی وجہ سے

(رَابِیة: رَبَا یَرۡبُوۡ: بڑھنا، زیادہ ہونا) **ای شدیدة زائدة فی الشدة** (قرطبی)

﴿اِنَّا لَمَّا طَغَا الۡمَآءُ﴾

(ہم نے جب سیلاب حد سے گزر گیا تو) پانی اپنی عام حد سے تجاوز کر گیا یا اپنے خزّان پر سرکش ہو گیا اور ایسا طوفان نوح میں ہوا اور یہ من قبلہ اس کی تائید کرتا ہے

﴿حَمَلْنٰکُمْ﴾

(تمہیں سوار کر دیا) تمہارے آباؤ اجداد کو اور اس وقت تم ان کی پشتوں میں تھے

﴿فِی الْجَارِیَةِ﴾

(کشتیوں میں) نوح کی کشتی میں (الف لام سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ کوئی عام کشتی نہیں تھی بلکہ حضرت نوح کی کشتی مراد ہے)

﴿لِنَجْعَلَهَا لَکُمْ﴾

(تاکہ ہم بنادئے اس واقعہ کو تمہارے لیے) تا کہ ہم اس (فعل) کو بنادئے اور (یہ فعل کیا ہے) مومنین کو نجات دینا اور کفار کو غرق کرنا

﴿تَذْکِرَةً﴾

(یادگار) عبرت/نصیحت اور بنانے والے کی قدرت، کمال غلبہ اور اس کی رحمت پر دلالت (یادگار بنادیں)

﴿وَّتَعِیَهَآ﴾

(اور محفوظ رکھے) اسے یاد رکھیں اور ابن کثیر مکی نے وتَعْیَهَا روایت کیا ہے عین کے سکون کے ساتھ، کتف کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے اور الوعی (ثلاثی مجرد) کا مطلب ہے کسی چیز کو اپنی ذات میں محفوظ کرنا اور الایعاء (غیر ثلاثی) کا مطلب ہے کسی غیر کے پاس کوئی چیز محفوظ کرنا

﴿اُذُنٌ وَّاعِیَةٌ﴾

(یاد رکھنے والے کان)اور اس کو یاد رکھتے ہیں یاد رکھنے والے کان اور ان کی شان میں سے یہ ہے کہ وہ یاد رکھتے ہیں نصیحت حاصل کرنے کے ساتھ، اس کی اشاعت کے ساتھ اور اس میں غور و فکر کرنے کے ساتھ اور اس کے موجب پر عمل کرنے کے ساتھ اور اُذُنٌ کی تنوین ان کانوں کی قلت پر دلالت کرتی ہے اور ان کی شان میں سے یہ ہے کہ یہ اپنی قلت کے باوجود جم غفیر کی نجات کا سبب ہیں اور ان کی نسلوں کے دوام کا سبب ہے اور نافع مدنی نے اُذْن تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے

﴿فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ﴾

(پھر جب پھونک ماردی جائے گئی صور میں ایک بار) جب اللہ نے قیامت کی ہولنا کی کو خوب اچھی طرح بیان کیا اور جھٹلانے والوں کے انجام سے آگاہ فرمایا اس کی عظمت بیان کرتے ہوئے اور اس کے ممکن ہونے پر تنبیہ کرتے ہوئے تو اب دوبارہ اس کی وضاحت کی طرف لوٹ رہا ہے اور مصدر کو صفت کے ساتھ مقید ہونے کی وجہ سے فعل کی نسبت مصدر کی طرف کرنا اچھا ہے اور فعل کو مذکر ذکر کرنا فاصلہ کی وجہ سے اچھا ہے۔ فعل کی نسبت جار مجرور کی طرف کرتے ہوئے نفخة نصب کے ساتھ پڑھا ہے اور اس سے مراد نفخہ اولیٰ ہے جس کے پھونکنے کے وقت نظام عالم خراب ہو جائے گا

﴿وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ﴾

(اُٹھایا جائے گا زمین اور پہاڑوں کو) زمین اور پہاڑوں کو ان کی جگہ سے اُٹھا دیا جائے گا محض اپنی قدرت کاملہ کے ساتھ یا زلزلہ کے توسط سے یا سخت آندھی کے ساتھ

﴿فَدُکَّتَا دَکَّةً وَّاحِدَةً﴾

(اُٹھا کر دفعۃً چور چور کر دیا جائے گا) دونوں کے مجموعہ میں سے بعض کو بعض کے ساتھ ایک بار ہی مارا جائے گا تو تمام (زمین و پہاڑ) ریزہ ریزہ ہو جائیں گئے یا ان کو دفعۃً پھیلایا جائے گا تو یہ ایسی زمین میں تبدیل ہو جائیں گے جس میں نہ کوئی پستی ہوگی اور نہ کوئی بلندی کیونکہ (الدك : کوٹنا) تسویہ (برابری) کا سبب

ہے۔اور اسی وجہ سے جس اُونٹنی کی کوہان نہ ہوا سے ''ناقة دكاء'' کہا جاتا ہے اور وسیع اور ہموار زمین کو ''ارض دكاء'' کہا جاتا ہے (دَقَّ يَدُقُ : یک بار مارنا ، جملہ کے دو معنیٰ ہوتے ہیں 1: مجموعہ 2: اجمال، یہاں جملہ مجموعہ کے معنی میں مستعمل ہے)

﴿ فَيَوۡمَئِذٍ ﴾

(تو اس روز) اس وقت

﴿ وَّقَعَتِ الۡوَاقِعَةُ ﴾

(ہونے والی واقعہ ہو جائے گی) قیامت قائم ہو جائے گی

﴿ وَانۡشَقَّتِ السَّمَآءُ ﴾

(اور پھٹ پڑے گا آسمان) ملائکہ کے نزول کی وجہ سے

﴿ فَهِیَ یَوۡمَئِذٍ وَّاهِیَةٌ ﴾

(تو وہ اس دن بالکل بودا ہو جائے گا) تو وہ اس دن ڈھیلا ڈھالا کمزور ہوگا (الواهية : کسی چیز کا بوسیدہ ہو کر گر پڑنا جیسے اس کے اجزا میں اب کوئی ربط باقی نہیں۔صاحب قاموس ''وهى'' کا معنی کرتے ہیں پھٹ جانا، شگاف پڑ جانا)

﴿ وَّ الۡمَلَكُ ﴾

(اور فرشتے) (ملک پر الف لام جنسی ہے اور بتا رہے ہے کہ) یہ ایسی جنس ہو جو فرشتوں کے ساتھ متعارف ہے

﴿عَلٰۤى اَرۡجَآئِهَا﴾

(اس کے کناروں پر) رضی اللہ عنہ رکر دیے جائے گے رضی اللہ عنہ یہ رجی کی جمع ہے الف مقصورہ کے ساتھ (سوال) جب سور پھونکا جائے گا تو تمام چیزیں فرشتے، آسمان ، دنیا سب کچھ فنا ہو جائیگا تو فرشتے اسکے کناروں پر کیسے کھڑے ہوں گئے؟ (جواب) یہ حقیقی طور پر نہیں ہوگا شاید کے یہ تشبیہ دینا ہے دنیا کے خراب ہونے کو اس عمارت کے تباہ ہونے کے ساتھ جس کے رہنے والے تباہی کے وقت اس کے اطراف وار دگرد میں جمع ہو جاتے ہیں۔اور اگر یہ اپنے ظاہر پر ہو (یعنی تشبیہ نہ ہو) تو فرشتوں کا ہلاک ہونا اس کے پیچھے ہوگا (یعنی) جب تمام چیزیں فنا ہو جائیں گئی تو اس کے بعد فرشتے ہلاک ہوں گئے (اثرٌ)

﴿ وَیَحۡمِلُ عَرۡشَ رَبِّكَ فَوۡقَهُمۡ ﴾

(اور آپکے رب کے عرش کو اپنے اوپر) (ھم ضمیر کے مرجع کے بتا رہے ہیں) ان فرشتوں نے اپنے اوپر جو آسمان کے کناروں پر ہیں یا ان آٹھ فرشتوں کے اوپر اٹھائے رکھا☆

سوال: جواب: (سوال)

ضمیر پہلے اور مرجع بعد میں کیوں ہے حالانکہ مرجع پہلے اور ضمیر بعد میں ذکر کی جاتی ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

فاعل کا مقام فعل کے بعد ہوتا ہے اور اس کے متعلقات وضمائر بعد میں ہوتے ہیں یہاں اگر چہ ضمیر پہلے ذکر کی گی ہے لیکن (ثمانیہ) فاعل مقدم کرنے کی نیت میں ہے

﴿یَوۡمَئِذٍ ثَمٰنِیَةٌ﴾

(اس روز آٹھ فرشتوں) رضی اللہ عنہ مرفوعا روایت ہے کہ ان فرشتوں کی تعداد آج چار ہے جب قیامت وقوع پذیر ہوگئی تو اللہ تعالیٰ دوسرے چار فرشتوں کے ساتھ ان کی مدد فرمائے گا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ فرشتوں کی آٹھ صفیں ہیں جن کی تعداد صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے اور شاید کہ یہ بھی تشبیہ دینا ہے اللہ کی عظمت کی وجہ سے اس چیز کے ساتھ جسکا مشاہدہ کیا جاتا ہے، بادشاہوں کے احوال سے (جب) قضاء عام (کھلی کچہری) کے لیے وہ لوگوں پر ظاہر ہوتے ہیں اور اسی بناء

پر فرمایا

﴿ يَوۡمَئِذٍ تُعۡرَضُونَ ﴾

(وہ دن جب تم پیش کیے جاؤ گے) یہ تشبیہ دینا ہے محاسبہ کے لیے بادشاہ کے سامنے لشکر کا پیش ہونا تا کہ وہ ان کے احوال کو جان لے

﴿ لَا تَخۡفٰى مِنۡكُمۡ خَافِيَةٌ ﴾

(تمہارا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہے گا) تمہارا کوئی راز اللہ تعالیٰ پر پوشیدہ نہیں رہے گا کیونکہ (اللہ تعالیٰ کے سامنے) پیش کرنا رازوں پر مطلع ہونے کے لیے ہے اور بے شک اس سے مراد افشاء حال اور عدل کرنے میں مبالغہ ہے یا تمہارا کوئی راز لوگوں پر پوشیدہ نہیں رہے گا جس طرح اللہ نے فرمایا یوم تبلی اسرائر اور امام حمزہ بن حبیب الذیات الکوفی اور امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے (لاتخفی) کو (فعل وفاعل کے درمیان) فاصلہ کی وجہ سے (لا یخفٰی) ''ی'' کے ساتھ پڑھا ہے

﴿ فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ ﴾

(پس جس کو دے دیا گیا اس کا نامہ اعمال دائیں ہاتھ) یہ اب اس پیش ہونے کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے

﴿ فَيَقُوۡلُ ﴾

(وہ کہے گا) خوشی خوشی

﴿ هَآؤُمُ اقۡرَءُوۡا كِتٰبِيَهۡ ﴾

(لو پڑھو میرا نامہ اعمال) ھا اسم فعل امر بمعنٰی خذ ہے اور اس میں بہت سی لغات ہیں اور اس کی بہترین لغات مندرجہ ذیل ہیں

اور اس کا مفعول محذوف ہے اور ''کتابیہ'' ''اقۡرَءُوۡا'' فعل کا مفعول ہے

سوال: جواب: (سوال)

''کتابیہ'' کو ''اقۡرَءُوۡا'' کا مفعول بنانے کی کیا وجہ ہے جبکہ اسے ''هَآؤُمُ'' کا مفعول بھی تو بنایا جا سکتا تھا؟

سوال: جواب: (جواب)

''اقۡرَءُوۡا'' فعل کا مفعول اس لیے بنایا ہے کیونکہ یہ دو قریب ترین عاملوں سے ہے (بصریوں کے مذہب کے مطابق عمل کیا گیا ہے)

(جواب ثانی)

اگر ''کتابیہ'' کو ''هَآؤُمُ'' کا مفعول ہوتا تو اس صورت میں ''اقۡرَءُوۡا'' کہا جاتا ہے کیونکہ جب تک ضمیر لوٹانا ممکن ہو تب تک حذف اولی ہے (یعنی ''کتابیہ'' کا عامل مقدم ہونے کی وجہ سے مؤخر عامل یعنی ''اقۡرَءُوۡا'' میں اس کی طرف ضمیر لوٹائی جاتی کیونکہ جب تک ممکن ہو ضمیر لوٹانا افضل ہے)

اور ''کتابیہ، حسابیہ، مالیہ اور سلطانیہ'' میں ''ھا'' سکت کے لیے ہے جو ملانے کی صورت میں ساقط ہو جاتی ہے جبکہ وقف کی حالت میں ثابت رہتی ہے اور امام (مصحف عثمانی) میں اس کے ثابت رہنے کی وجہ سے وقف کرنا مستحب ہے اور کیونکہ یہ ''ھا'' مصحف عثمانی میں موجود ہے اس وجہ سے ملا وصل کی صورت میں بھی اسی ثابت رکھ کر پڑھا گیا ہے

﴿اِنِّیۡ ظَنَنۡتُ اَنِّیۡ مُلٰقٍ حِسَابِیَهۡ﴾

[مجھے یقین تھا کہ میں اپنے حساب کو ضرور پہنچوں گا] یعنی میں جانتا تھا اور شاید کہ علم کو ظن کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے کہ اس بات کا شعور لانے کے لیے کہ وہ وسوسے/شبہات/خطرات جو اچانک دل میں پیدا ہوتے ہیں، غالبا علوم نظری ان سے جدا نہیں ہوتے وہ اعتقاد میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں کرتے

سوال: جواب: (سوال)

کامل مومن تو آخرت/حساب وکتاب پر مکمل یقین رکھتا ہے تو پھر ظن (افعال شک) کو کیوں استعمال کیا؟

سوال: جواب: (جواب)

ظن بمعنی علم ہے اب اعتراض ہوتا ہے جب ظن، علم کے معنی میں ہے تو ظن کو کیوں استعمال نہیں کیا؟ تو اس کا جواب یہ کہ مومن آخرت پر کامل یقین رکھتا ہے لیکن کچھ ایسے تفصیلات ہیں جن کو نظر وفکر کے ساتھ جانا جاتا ہے یعنی علوم نظری کے ساتھ ان کا علم حاصل کیا جاتا ہے مثلا یہ کہ سورج کتنی بلندی پر ہوگا، میزان کیسے قائم ہوگا، حساب وکتاب کے معاملات کیسے وقوع پذیر ہونگے وغیرہ یہ سب چیزیں علوم نظری کے ساتھ حاصل ہوتی ہیں پس اس بناء پر افعال شک کو استعمال کیا البتہ اگر افعال یقین کو استعمال کیا جاتا تو ان چیزوں کا علم بھی یقینی ہو جاتا

﴿فَهُوَ فِیۡ عِیۡشَةٍ رَّاضِیَةٍ﴾

[پس یہ خوش نصیب پسندیدہ زندگی بسر کرے گا] صیغہ کے ساتھ نسبت کے طور پر یا فعل کو (عیشۃ) کے لیے مجاز بنایا گیا ہے

سوال: جواب: (سوال)

عیشۃ موصوف اور راضیۃ صفت ہے اور اگر راضیۃ اسم فاعل کا صیغہ ہو تو معنی بنتا ہے کہ راضی ہونے والی زندگی جبکہ زندگی تو راضی نہیں ہوتی بلکہ جو انسان جنت میں ہے وہ راضی ہوتا ہے تو پھر معنیٰ کیسے درست ہوگا؟

(جواب اول)

"ذات رضی" سے علامہ بیضاوی اس بات کا جواب دے رہے ہیں کہ "راضیة" اسم فاعل کا صیغہ نہیں ہے بلکہ یہ اسم منسوب ہے جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ نسبت کبھی اسم فاعل کیصیغہکے ساتھ ہوتی ہے تو یہاں اسم فاعل کے صیغہ کے ساتھ نسبت کی بناء پر "راضیة" کو "عِیۡشَةٍ" کی صفت بنایا گیا ہے معنٰی یوں ہوگا "عِیۡشَةٍ ذات رضی۔ یعنی رضا والی زندگی"

(جواب ثانی)

فعل کی نسبت اس کے ظرف کی طرف کرنا مجازی طور پر ہے یعنی فعل کی نسبت اس کے فاعل حقیقی کی طرف نہیں ہے بلکہ اس کے ظرف کی طرف کی گئی ہے اس لیے یہاں مجاز عقلی ہے

﴿فِیۡ جَنَّةٍ عَالِیَةٍ﴾

[عالیشان جنت میں] رضا والی زندگی یہ ہے کہ (زندگی) تمام شوائب (ہر قسم کے غم واندوہ) سے پاک وصاف ہو، دائمی ہو، تعظیم کے ساتھ ملی ہوئی ہو (اس کے دو معنی ہیں 1 حقیقی 2: مجازی) (حقیقی معنٰی) بلند مکان والی کیونکہ وہ آسمان میں (واقع) ہے ی معنٰی درجات/محلات/ درخت بلند ہیں

﴿قُطُوۡفُهَا﴾

[جس کے خوشے] قطف کی جمع ہے (اور) قِطف ان خوشوں کو کہا جاتا ہے جن کو جلدی کے ساتھ چنا جاتا ہے اور قطف فتح کے ساتھ مصدر ہے (مصدر کی جمع نہیں لائی جاتی)

﴿دَانِیَةٌ﴾

[جھکے ہوں گے] بیٹھا ہوا شخص (بھی) انہیں تناول کرے گا

﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا﴾

【کھاؤاور پیو】

سوال:جواب:(سوال)

اس جملہ کا ماقبل کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے اور نہ ہی کوئی حرف عطف مذکور ہے، معنی کیسے درست ہوگا ؟

سوال:جواب:(جواب)

قول کو مضمر کرنے کے ساتھ (یعنی اس سے پہلے یُقالُ لھم محذوف ہے)

سوال:جواب:(سوال)

کلام میں پہلے ظننت کے لفظ مذکور ہیں یعنی مفرد کا ذکر کیا گیا ہے اور یہاں کلوا یعنی جمع کا صیغہ ذکر کیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال:جواب:(جواب)

ضمیر کو جمع ذکر کرنا معنی کی بناء پر ہے۔

﴿ هَنِيْٓئًا﴾

【مزے اُڑاؤ】اکلاوشربا سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ(ھنیا ء موصوف کی)صفت ہے یا ھنئتم ھنیأ سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ مفعول مطلق ہے

﴿ بِمَآ اَسْلَفْتُمْ﴾

【یہ ان اعمال کا اجر ہے جو تم نے آگے بھیجے دیے】یہ اجر ہے ان کا جو کچھ تم نے اعمال صالحہ میں سے آگے بھیجا(سلف اس چیز کو کہتے ہیں جو پہلے بھیج دی گئی ہو)

﴿فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَة﴾

【گزشتہ دنوں میں】دنیا کے گزرے ہوئے ایام میں(الخالیہ کے دو معنی ہیں ایک خالی ہونا ور دوسرا گزرنا)

﴿ وَاَمَّا مَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ فَيَقُوْلُ ﴾

【اور جس کو دیا جائے گا اس کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں وہ کہے گا】وہ کہے گا جب وہ اعمال کی قباحت اور برے انجام کو دیکھے گا

﴿يٰلَيْتَنِىْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَه يٰلَيْتَهَا﴾

【اے کاش! مجھے نہ دیا جاتا میرا نامہ اعمال اور میں نہ جانتا میرا حساب کیا ہے اے کاش!】(ھا ضمیر کے مرجع کے بارے میں بتایا جارہا ہے کیونکہ مرجع صراحۃ مذکور نہیں ہے اس لیے اس کے بارے میں تین احتمال ہیں)

(پہلا مرجع)

کاش کہ وہ موت جو مجھے آئی تھی

﴿ كَانَتِ الْقَاضِيَة﴾

【موت نے ہی قصہ پاک کردیا ہوتا】وہ میرا کام تمام کردیتی۔ مجھے اس کے بعد دوبارہ زندہ ہی نہ کیا جاتا

دوسرا مرجع)

یا کاش کہ یہ حالت موت ہوتی اور میرا قصہ پاک کردیتی گویا کہ وہ ایسی حالت سے ملے گا جو موت سے بھی زیادہ تلخ ہوگئی پس وہ اس حالت کے وقت موت کی تمنا کرے گا

(تیسرا مرجع)

یا کاش دنیا کی زندگی موت ہوتی اور میں زندہ پیدا ہی نہ ہوتا (دنیا میں پیدا ہی نہ کیا جاتا یعنی پیدائش کے وقت ہی موت سے دوچار ہو جاتا)

﴿مَآ اَغۡنٰی عَنِّیۡ مَالِیَهۡ﴾

[آج میرا مال میرے کسی کام نہ آیا] میرے مال اور اولاد/غلام میں سے کسی چیز نے کچھ نفع نہیں دیا

("مالیه" میں دو احتمال ہیں

پہلا احتمال

مال مضاف اور "ی" ضمیر مضاف الیہ اس ترکیب کے مطابق صرف مال ہی مراد ہوگا

دوسرا احتمال

"ما" اسم موصول "ل" حرف جار، ی ضمیر مجرور اس ترکیب کے مطابق مال وزر، غلام، جانور وغیرہ سب مراد ہونگے کیونکہ "ما" عموم پر دلالت کرتا ہے یا ما نافیہ ہے اور اغنی فعل کا مفعول محذوف ہے (کیونکہ "ما" نافیہ حرف ہے اور حرف کا ترکیب کلام میں کوئی محل نہیں ہوتا) یا "ما" استفہام انکاری ہے جو اغنی فعل کا مفعول ہے (کیونکہ "ما استفہام انکاری" اسم ہوتا ہے اور اسم کا محل میں اعتبار ہوتا ہے)

﴿هَلَكَ عَنِّیۡ سُلۡطٰنِیَهۡ﴾

[میری بادشاہی بھی فنا ہوگئی] میری بادشاہت اور لوگوں پر میرا تسلط یا میری وہ حجت جس کے ساتھ میں دنیا میں دلیل قائم کیا کرتا تھا (یعنی کبھی وہ کہتا کہ ایک بار جب انسان مر کر مٹی ہو جائے گا تو دوبارہ زندہ کیسے کیا جائے گا؟ قیامت کے دن حساب و کتاب کیسے ہوگا؟ وغیرہ وہ ان چیزوں کو ناممکن تصور کرتا تھا)

﴿خُذُوۡهُ﴾

[پکڑ لو اسے] (اس سے پہلے قول محذوف ہے) یعنی اللہ جہنم کے داروغوں سے فرمائے گا (خَزَنَة یہ خازن کی جمع ہے بروزن فَعَلَة جیسے کافر کی جمع كَفَرة آتی ہے)

﴿فَغُلُّوۡهُ ثُمَّ الۡجَحِیۡمَ صَلُّوۡهُ﴾

[اس کی گردن میں طوق ڈال دو پھر اسے دوزخ میں جھونک دو] پھر تم اسے جحیم میں ہی جھونک دو اور (جحیم) بہت بڑی دہکتی آگ ہے (الجحیم کو مقدم کر کے حصر کا معنی حاصل ہو رہا ہے، حرف نفی اور حرف استثناء کو بھی ذکر کرنا اسی مقصد کے لیے

سوال: جواب: (سوال)

اتنا بڑا عذاب کیوں دیا جا رہا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کیونکہ یہ لوگوں پر تکبر (غرور) کیا کرتا تھا

﴿ثُمَّ فِیۡ سِلۡسِلَةٍ ذَرۡعُهَا سَبۡعُوۡنَ ذِرَاعًا﴾

[پھر ستر گز لمبی زنجیر میں] یعنی طویل (عدد معین مراد نہیں ہے بلکہ یہ لمبا ہونے سے کنایہ ہے)

﴿فَاسۡلُكُوۡهُ﴾

[اسے جکڑ دو] اس کو اس میں پرو دو پس اس کو اس میں داخل کر دو اور وہ اس (زنجیر) کے درمیان جکڑا ہوا ہوگا اور حرکت کرنے پر قادر نہیں ہوگا اور لفظ سلسلہ کو مقدم کرنا جحیم کو مقدم کرنے کی طرح ہے (یعنی جس طرح جحیم کو مقدم کرنے سے حصر کا معنی حاصل ہو رہا ہے اسی طرح یہاں بھی حصر کا معنی حاصل ہو) تخصیص پر دلالت کرنے کے لیے اور جن انواع کے ساتھ عذاب دیا جائے گا ان انواع کے اہتمام کے ذکر پر دلالت (کرنے کے لیے سلسلہ کو مقدم کیا گیا ہے

جحیم کو مقدم کرنے کی طرح ہے) اور ثم شدت میں ان دونوں عذابوں کے درمیان فرق بیان کرنے کے لیے ہے (''ثم'' مہلت کے لیے استعمال نہیں ہورہا یعنی یہ اپنے اصل معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازی معنی یعنی ترتیب رتبی کے لیے ہے)

سوال: جواب: (سوال)

اتنا سخت عذاب کیوں دیا جارہا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

﴿ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ﴾

[بے شک وہ یعنی بدبخت یعنی ایمان نہیں لایا تھا اللہ پر جو بزرگ و برتر ہے] مبالغہ کے لیے استئناف کے طریقہ پر اس کی تعلیل بیان کی جارہی ہے (مبالغہ سے مراد یہ ہے کہ کلام کم اور معانی زیادہ ہیں)

سوال: جواب: (سوال)

اللہ کی بہت سی صفات ہیں صفتِ عظیم کو ذکر کرنے سے کیا کوئی خاص فائدہ حاصل ہورہا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

صفتِ عظیم کو ذکر کرنا اس بات کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ عظمت کی مستحق اللہ ہی کی ذات ہے پس (اب جو بھی) اپنے آپ کو بڑے سمجھے گا/تکبر کرے گا وہ اس عذاب کا مستحق ہوگا یعنی یستوجب الشی: کسی چیز کا مستحق ہونا یعنی

﴿ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ﴾

[اور نہ ترغیب دیتا تھا مسکین کو کھانا کھلانے کی]

سوال: جواب: (سوال)

ابھارا تو کسی فعل پر جاتا ہے جبکہ یہاں تو کوئی فعل مذکور ہی نہیں؟

سوال: جواب: (جواب)

(طعام سے پہلے بذل مصدر محذوف ہوگا یا طعام اطعام کے معنی میں ہوگا) وہ طعامِ مسکین کے خرچ پر نہیں اُبھارتا تھا یا اس کے کھلانے پر نہیں اُبھارتا تھا چہ جائیکہ کہ وہ اپنے مال سے خرچ کرتا اور یہ بھی جائز ہے کہ ابھارنے کا ذکر کرنا اس بات کا شعور دلانے کے لیے ہے کہ مسکین کے کھانے پر ابھارنے کو ترک کرنے والے کا یہ حال ہے (سخت عذاب سے دوچار ہے) تو جو خود نہیں کھلاتا اس کا کیا حال ہوگا اور اس میں دلیل ہے کہ کفار فروع کے بھی مکلّف ہیں (اس میں ایک اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ ہے یعنی شوافع کے نزدیک کفار اصول یعنی اللہ پر ایمان لانا، رسالت وقیامت وغیرہ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ فروع یعنی نماز روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کے بھی مکلّف ہیں جبکہ احناف کا کہنا ہے کہ کفار صرف اصول کے مکلّف ہیں شوافع احناف پر اعتراض کرتے ہیں کہ ان آیات میں یعنی لا یحض علی ......اور ولم نک من المصلین یعنی کفار کو عذاب کیوں دیا جارہا ہے؟ تو احناف اس اعتراض کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح اصول پر عقیدہ رکھنا ضروری ہے بالکل اسی طرح فروع پر بھی عقیدہ رکھنا ضروری ہے کیونکہ جب کوئی شخص اللہ پر ایمان ہی نہیں لائے گا تو وہ نماز، روزہ کا کیسے پابند ہوگا؟

سوال: جواب: (سوال)

ان دو امروں یعنی کان لا ...اور ولا یحض علی ...یعنی ہی کیوں خاص کیا اس کی کیا وجہ ہے؟ (جواب) شاید کہ دو امروں کو (خاص کر) ذکر کرنا اس لیے ہے کہ عقائد میں سب سے قبیح ترین چیز اللہ پر ایمان نہ لانا ہے یعنی انکار کرنا ہے اور خصائل ورذائل میں سب سے زیادہ قبیح بخل اور دل کی سختی ہے سوال: جواب: (سوال) بخل تو قرآن سے ثابت ہے دل کی سختی کا معنی آپ نے کہاں سے حاصل کیا؟

سوال: جواب: (جواب)

مسکین اس چیز کا حق دار ہے کہ اس کو کھانا کھلایا جائے لیکن وہ اتنا سنگ دل ہو چکا ہے کہ کسی دوسرے کو بھی اس کام پر نہیں ابھارتا

﴿ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ﴾

﴿پس آج یہاں اس کا کوئی قریبی دوست نہیں﴾ قریبی/جگری دوست جو اس کی حفاظت کرتا

﴿ وَّلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴾

﴿اور نہ کوئی طعام بجز پیپ کے﴾ اہل جہنم کا دھون اور ان کی پیپ (باقی ماندہ چیز کے لیے **فُعالة** کا وزن استعمال کیا جاتا ہے)**غسلین** ،**غسل** سے **فِعْلِيْن** کے وزن پر مشتق ہے

﴿ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ﴾

﴿جسے کوئی نہیں کھاتا بجز خطا کاروں کے﴾ خطاء کے دو معنی ہیں 1: جان بوجھ کر غلطی کرنا 2: لاعلمی کی بناء پر غلطی کرنا گناہ کرنے والے ۔ یہ عربوں کے قول **خطئی الرجلُ** سے مشتق ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی جان بوجھکر غلطی کرے نہ کہ اس خطاء سے مشتق ہے جو صواب کے متضاد ہے اور ہمزہ کو یا سے بدلنے کی بناء پر خاطئون] کو خاطیون بھی پڑھا گیا ہے اور ہمزہ کو گرانے کے ساتھ بھی پڑا گیا ہے

﴿ فَلَآ اُقْسِمُ ﴾

﴿پس میں قسم کھاتا ہوں﴾ (لا اُقسم کے لا کے بارے میں تین احتمال ہیں) معاملہ کے ظاہر ہونے اور قسم کے ساتھ اس کے مستغنی ہونے کی وجہ سے صورت میں "لا"، نافیہ ہے میں قسم کھاتا ہوں اور اس صورت میں "لا" زائدہ برائے تاکید ہے یا کفار بعث کا انکار کرتے تھے پس "لا" کے ساتھ ان کے اس عقیدہ کا رد کرنا ہے اور **اقسم** جملہ مستانفہ ہے

﴿ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ﴾

﴿ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور جنھیں تم نہیں دیکھتے﴾ جن کا تم روزمرہ زندگی میں مشاہدہ کرتے ہو اور اور جو تم سے پوشیدہ ہیں اور یہ تُبْصِرُوْنَ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ خالق اور تمام مخلوقات کو شامل ہے

﴿ اِنَّهٗ ﴾

﴿بے شک یہ﴾ اس جانب اشارہ ہے کہ "ہ"، ضمیر کا مرجع قرآن ہے

﴿ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ ﴾

﴿رسول کا قول﴾ جو انہیں اللہ کی طرف سے پہنچتا ہے بذات خود اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں فرماتے

﴿ كَرِيْمٍ ﴾

﴿جو عزت والے ہیں﴾ اللہ کے دربار گوہر بار میں اور وہ حضرت **محمد** ﷺ ہیں یا جبرئیل ہیں

﴿ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ﴾

﴿اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں﴾ جس طرح تم نے پہلی دفعہ گمان کیا

﴿ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ﴾

﴿لیکن تم بہت کم ایمان لاتے ہو﴾ جب تمہارے لیے اس کا سچا ہونا ظاہر ہوتا ہے تو تم اپنے عناد و بغض کی زیادتی کی وجہ سے بہت کم اس (مقدس کلام) کی تصدیق کرتے ہو

﴿ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ﴾

﴿اور یہ نہ ہی کسی کاہن کا قول ہے﴾ جس طرح کہ تم دوسری مرتبہ گمان کرتے ہو

﴿ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴾

[تم لوگ بہت کم توجہ کرتے ہو] بہت کم توجہ (قَلِیْلًا تذکرا سے اس جانب اشارہ ہے کہ یہ مصدر محذوف کی صفت ہیں)

اسی وجہ سے تم پر معاملہ ،ملتبس (خلط ملط) ہو گیا، شاعریت کی نفی ایمان کے ذکر کے ساتھ کی گئی ہے، کاھنیت کی نفی غور وفکر کرنے کے ساتھ کی گئی ہے کیونکہ قرآن کی شاعریت کے ساتھ عدم مشابہت ایک واضح بیان ہے، اس بات کا انکار صرف سرکش ہی کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس قرآن پاک کی کہانت سے جدائی ایک مخفی امر ہے کیونکہ یہ رسول کے احوال اور قرآن کے ان معانی پر توجہ کرنے پر موقوف ہے جو کاہنوں کے طریقے اور ان کے اقوال کے معانی کے منافی ہیں

(جب اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ وہ بیان فرمائے کہ قرآن شاعریت نہیں تو ایمان کا ذکر فرمایا اور جب یہ بات واضح کرنے کا ارادہ فرمایا کہ قرآن کاھن کا کلام نہیں تو پھر ''غور وفکر/التذکر کا ذکر فرمایا اس میں حکمت عملی یہ ہے کہ قرآن وشاعریت میں واضح فرق ہے جبکہ قرآن وکہانت میں فرق ایک ایسا مخفی معاملہ ہے جس کا ادراک انسان تفکر وتدبر سے ہی کرتا ہے کیونکہ قرآن شیطان کی مذمت کرتا ہے جبکہ کہانت اس کی مدح سرائی کرتی ہے)

اور امام ابن کثیر مکی اور امام ابن عامر شامی اور امام یعقوب حضرمی بصری نے (یومنون اور یذکرون) ''ی'' کے ساتھ پڑھا ہے

﴿ تَنْزِيْلٌ ﴾

[یہ نازل شدہ ہے] وہ نازل شدہ ہے (اس سے پہلے 'ھو' ضمیر نکال کر اس جانب اشارہ کیا گیا ہے کہ ''تنزیل'' مبتدا محذوف کی خبر ہے)

﴿ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴾

[رب العالمین کا] اللہ نے قرآن کو جبرئیل کی زبان پر نازل کیا

﴿ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴾

[اگر وہ خود گھڑ کر بعض باتیں ہماری طرف منسوب کرتا] افتراء کو تقوّل کا نام دیا گیا ہے کیونکہ وہ (افتراء) قول متکلف ہے اور اقوال مفترا کو اقاویل کا نام دیا گیا ہے تحقیر بیان کرنے کے ساتھ (کیونکہ جمع کے جو اوزان ہیں ان میں تحقیر پائی جاتی ہے، اقاویل کے بارے بعض نے کہا کہ یہ جمع الجمع ہے)اقاویل ،افعولة کے وزن پر قول سے جمع ہے جیسے أضاحيك (تقول: کسی پر بہتان باندھنا، تصنّع اور بناوٹ کرنا۔ الاقاویل: وہ جھوٹی باتیں جو بطور افترا اور بہتان کہی گئی ہوں)

﴿ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴾

[تو ہم اس کا دائیاں ہاتھ پکڑ لیتے] (ضمیر کے مرجع کی طرف اشارہ کر رہے ہیں) اگر ضمیر اللہ کی طرف راجع ہو تو ''یمین'' سے مراد قوت ہے اور اگر نبی پاک ﷺ کی طرف راجع ہو تو دائیں ہاتھ مراد ہے (یمین: سے مراد یا تو قوت وقدرت ہے اس صورت میں ''منه''میں ''من'' زائدہ ہوگا۔ عبارت یوں ہوگئی ''لاخذناه باليمين'' یعنی ایسے مفتری کو ہم پوری قوت پکڑ لیں گے اور اگر یمین کا معنی دایاں ہاتھ لیا جائے تو پھر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس مفتری کا دایاں ہاتھ پکڑ لیں گے تاکہ وہ بھاگ نہ سکیں اور پھر اس کی رگ جان کاٹ دیں گے (ضیاء القرآن)

﴿ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ﴾

[پھر ہم کاٹ دیتے اس کی رگ دِل] اس کی دل کی رگ کو کاٹ دے گئے اس کی گردن کو مارنے کے ساتھ اور یہ تصویر ہے (استعارہ/تمثیل) ہے اس کو ہلاک کرنے کے لیے شدید طریقہ کے ساتھ جو بادشاہ کرتے ہیں اس کے ساتھ جس پر وہ غضبناک ہوتے ہیں (یعنی جب بادشاہ کسی کو مارنے کا حکم دیتا ہے تو جلاد تلوار لہراتا ہوا آتا ہے جس کو دیکھ کر مجرم کا خون خشک ہو جاتا ہے وہی تمثیل بیان کی جارہی ہے)اور وہ یہ ہے کہ جلاد اس کو دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتا ہے اور تلوار کو لہراتا ہے اور اسکی گردن کو قلم کر دیتا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یمین قوۃ کے معنی میں ہے (دل کی ایسی رگ کو ''وتین'' کہتے ہیں جو اگر کٹ جائے تو انسان فوراہلاک ہو جاتا ہے (لسان)ایسی رگ جو جگر کو سیراب کرتی ہے جب کٹ جائے تو انسان مرجاتا ہے (المفردات))

﴿ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ ﴾

[پھر تم میں سے کوئی ایک بھی ہمیں اس سے] قتل سے یا مقتول سے

﴿ حٰجِزِيۡنَ ﴾

[اسے روکنے والا نہیں ہوتا] دور کرنے والا۔ دافعین ،احد کی صفت ہے

سوال: جواب: (سوال)

موصوف مفرد ہے اور صفت جمع کیوں ذکر کی جا رہی ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

نکرہ نفی کے تحت داخل ہوا ہے اس لیے عام ہے اور خطاب عام لوگوں کو کیا جا رہا ہے

﴿ وَاِنَّهٗ ﴾

[اور بے شک یہ] اس جانب اشارہ ہے کہ ''ہ'' ضمیر کا مرجع قرآن ہے

﴿ لَتَذۡكِرَةٌ لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴾

[ایک نصیحت ہے پرہیزگاروں کے لیے] کیونکہ متقین اس سے نفع حاصل کرتے ہیں

﴿وَاِنَّا لَنَعۡلَمُ اَنَّ مِنۡكُمۡ مُّكَذِّبِيۡنَ﴾

[اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے بعض جھٹلانے والے ہیں] ہم انکے جھٹلانے پر ان کو جزا (سزا) دیں گے

﴿ وَاِنَّهٗ لَحَسۡرَةٌ عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴾

[اور یہ بات باعث حسرت ہوگی کفار کے لیے] جب مومنین کے ثواب کو دیکھے گئے

﴿ وَاِنَّهٗ لَحَـقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴾

[اور بے شک یہ یقیناً حق ہے] ایسا یقین جس میں کوئی شک وشبہ نہیں (یہاں ''حق'' صفت ہے جسے موصوف ''الیقین'' کی طرف مضاف کیا گیا ہے معنی ہوگا ایسا یقین جو سراسر حق ہے جس میں باطل کی ذرا ملاوٹ تک نہیں)

﴿ فَسَبِّحۡ بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴾

[پس اے حبیب! آپ تسبیح کیا کرئے اپنے رب کی جو عظمت والا ہے] پس آپ اپنے رب کی تسبیح کرئے اس کے عظیم نام کے ساتھ اس وجہ سے کہ وہ منزہ ہے

کل آیات	بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ	سورہ المعارج	سورة نمبر

﴿سَاَلَ سَآئِلٌۢ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ﴾

[ترجمہ (مطالبہ کیا ہے ایک سائل نے ایسے عذاب کا جو ہو کر رہے] امام بیضاوی وضاحت فرما رہیں کہ **سأل سائل دعادا ع به** کے معنی میں ہے دعا داع بہ، استدعا کے معنی میں ہے یعنی اس سائل نے عذاب کو طلب کیا ہے اور اسی وجہ سے فعل کو ''ب'' کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے (اس جانب اشارہ ہے کہ سأل ،دعا کے معنیٰ میں ہے کیونکہ سأل یا تو بغیر کسی واسطہ کے یا حرف جار ''عن'' کے ساتھ متعدی ہوتا ہے)

(سوال) سوال: جواب:

(سائل کون تھا اس کے بارے میں امام بیضاوی تین احتمالات ذکر کئے ہیں)

(پہلا احتمال)

اور سائل نضر بن حارث ہے کیونکہ اس نے کہا تھا کہ الٰہیٰ! جو کلام نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں سناتے ہیں اگر یہ حق ہے اور تیری طرف سے (نازل کردہ) ہے تو پس تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش برسایا ہم پر دردناک عذاب لے آ

(دوسرا احتمال)

یا سائل ابوجھل ہے اس نے کہا ہم پر آسمان سے کوئی پتھر کا ٹکڑا گرا اور اس نے سوال از روئے استھزا (مذاقا) کیا تھا

(تیسرا احتمال)

یا سوال کرنے والے نبی برحق ﷺ ہیں کہ آپ ﷺ نے (ان پر واقع ہونے والے) عذاب کو جلدی طلب کیا۔ نافع (مدنی) اور ابن عامر (شامی) نے اِسے ''سال'' پڑھا ہے یا تو قریش کی لغت پر ''سوَال'' سے مشتق ہے شاعر (حضرت حسان ابن ثابت رضی اللہ عنہ) نے کہا!

(قبیلہ) ھذیل نے نبی پاک ﷺ سے فاشی کے بارے میں سوَال کیا

(قبیلہ) ھذیل والے اس سوَال کرنے کی بدولت گمراہ ہوگئے اور انہوں نے حقیقت کو نہ پایا

یا یہ سیلان سے مشتق ہے اور اس کی تایید کرتا ہے کہ اس کو سال سیل پڑھا گیا ہے اس بناء پر کہ السیل' مصدر ہے جو کہ سائل کے معنی میں ہے جیسے غور ،غائر کے معنی میں ہے۔ اس صورت میں معنٰی یہ ہوگا کہ عذاب کی وادی بہی

سوال: جواب: (سوال)

عذاب کی وادی تو جہنم میں بہے گئی، پھر فعل کو ماضی کیوں ذکر کیا؟

سوال: جواب: (جواب)

فعل کو ماضی ذکر کرنا وقوعِ عذاب کے تحقق کی وجہ سے ہے۔ یا تو یہ عذاب کی وادی دنیا میں بہے گئی اور وہ بدر کا قتل ہے یا آخرت میں بہے گئی اور وہ (جہنم کی) آگ کا عذاب ہے

﴿لِّلْكٰفِرِيْنَ﴾

【(وہ سن لے) یہ تیار ہے کفار کے لیے】یہ عذاب کی صفت ثانیہ ہے (اس صورت میں پہلی صفت واقع (شبہ فعل) ہوگئی) یا واقع (شبہ فعل) کا صلہ (کے متعلق) ہے۔ اور اگر صحیح ہو کہ سوَال ان لوگوں کے متعلق تھا جن پر عذاب واقع ہوگا تو یہ (للکافرین) اس سوال کا جواب ہوگا۔

سوال: جواب: (سوال)

اگر سائل فعل اپنے اصلی معنی میں ہے تو پھر ''ب'' کیساتھ متعدی کیوں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

''ب'' اس بات پر دلالت کرنے کہ لیے ہے کہ سائل، اھتم (تیار کرنا) کے معنی کو متضمن ہے

﴿لَيْسَ لَهٗ دَافِعٌ﴾

【اسے کوئی ٹالنے والا نہیں】اس (عذاب) کو کوئی دور کرنے والا نہیں

﴿مِّنَ اللّٰهِ﴾

【یہ اللہ کی طرف سے ہے】اللہ کی طرف سے۔ کیونکہ اس عذاب کے ساتھ اللہ کا ارادہ معلق ہے

﴿ ذِى الْمَعَارِجِ﴾

【جو عروج کے زینوں کا مالک ہے】بلند زینوں والا اور یہ ایسے درجات ہیں جن میں پاک کلام اور نیک اعمال صعود (بلند) کرتے ہیں یا ایسے درجات ہیں جن میں مؤمنین حالتِ سلوک میں ترقی کی منازل طے کرتے ہیں یا دار ثواب میں۔ یا ان درجات سے مراد مراتبِ ملائکہ ہیں (جو انہیں عطا کیئے گئے ہیں) یا آسمان ہیں پس ملائکہ ان (آسمانوں) میں عروج کرتے ہیں (مَعَارِج ،عروج سے ہے، عروج کا معنی بلند ہونا' اُونچا ہونا ہے اس سے اسم آلہ ''مِعْرَاج'' اور ''مِعْرَج'' ہے اسی کی جمع ''مَعَارِج اور مَعَارِيج ہے۔ ان کا معنی ہے سیڑھیاں زینے جن کے ذریعے انسان اوپر چڑھتا ہے، حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں کہ مَعَارِج

سے مراد آسمان ہیں کیونکہ وہ بھی درجہ بدرجہ ایک دوسرے کے اوپر ہیں) (تفسیر ضیاء القرآن)

﴿تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوۡحُ اِلَيۡهِ فِىۡ يَوۡمٍ كَانَ مِقۡدَارُهٗ خَمۡسِيۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ﴾

[عروج کرتے ہیں فرشتے اور جبرئیل اللہ کی بارگاہ میں ۔ یہ عذاب اس دن ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے] تمثیل اور تخیل کے طور پر ان معارج کی بلندی اور ان کی مسافت کی دوری کو بیان کرنے کے لیے یہ جملہ مستأنفہ ہے ۔ اور معنٰی یہ ہے کہ اگر کسی زمانہ میں ان معارج کو طے کرنے کا وقت مقدر مان لیا جائے تو وہ طے کرنے کا زمانہ دنیا کے پچاس ہزار سالوں کی مقدار کے برابر ہوگا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ فرشتے اور روح (حضرت جبرئیل) اللہ کے عرش کی طرف ایسے دن میں عروج کرتے ہیں جس (دن) کی مقدار پچاس ہزار سالوں کی مقدار کی طرح ہے اس طرح کہ وہ اس ایک دن میں اتنا فاصلہ طے کرتے ہیں کہ اگر فرض کیا جائے جتنا فاصلہ انسان پچاس ہزار سالوں میں طے کرتا ہے کیونکہ اسفل عالم اور عرش کی بلندیوں کے درمیان پچاس ہزار سالوں کی مسافت ہے کیونکہ کہ زمین کے مرکز اور آسمان کے پلندے کے درمیان جو مسافت ہے وہ پانچ سال ہے اور ان سات آسمانوں، کرسی اور عرش (میں سے ہر ایک کی موٹائی) اسی طرح ہے ۔ اور جس طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے فی یوم کان مقدارہ الف سنہ (ایسے دن میں جسکی مقدار ایک ہزار سال ہے) تو اس سے مراد زمین سے آسمان دنیا کی بلندی تک ان کے عروج کا زمانہ ہے (ترکیب کے بارے میں بتارہے ہیں) اور کہا گیا ہے کہ فی یوم ، واقع (شبہ فعل) کے متعلق ہے یا سال کے متعلق ہے جب اسے "السیلان " سے (مشتق) بنایا جائے ۔

اور (فی یوم) سے مراد قیامت کا دن ہے ۔ اور اس دن کی طوالت ، یا تو کفار پر اس کی شدت کی وجہ سے ہے ، یا اس میں واقع ہونے والے حالات ومحاسبات کی کثرت کی وجہ سے ہے ، یا اس دن کا طویل ہونا حقیقت کی بناء پر ہے (یعنی درحقیقت یہ دن اسی قدر طویل ہوگا)

(حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا ! اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے ، یہ دن مومن کے لیے بڑا مختصر کر دیا جائے گا ۔ یہاں تک کہ جتنا وقت ایک فرض نماز ادا کرنے میں لگتا ہے اس سے بھی اسے مختصر کر دیا جائے گا)

اور روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں اور انکو علیحدہ ذکر کرنا ان کی فضیلت کی وجہ سے ہے ۔ یا روح سے مراد ایسی مخلوق ہے جو ملائکہ سے بھی عظیم ہے (علامہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ " الروح " سے مراد روح انسانی ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے اور الانبیاء و اولیاء کی ارواح مقدسی دوری اور غفلت کی پستیوں سے پرواز کر کے رب ذوالجلال کے حریم قرب میں نشیمن بنالیا کرتی ہیں)

﴿فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِيۡلًا﴾

[(ایسا) صبر کیجیے جو بہت خوبصورت ہو] جس میں جلد بازی اور اضطراب قلب کا شائبہ (بھی) نہ ہو ۔ اور (یہ) سال کے متعلق (یعنی معنوی ربط) ہے کیونکہ سؤال کرنا از روئے استھزا یا حق کی مخالفت کرنے کی وجہ سے تھا (از روئے استھزا سؤال کرنا یا حق کی مخالفت کرنا) یہ ان چیزوں میں سے تھا جو آپ ﷺ کے قلب انور کو بے چین و بے قرار کر دیتی تھی ۔ یا سؤال کرنا تنگ کرنے اور مدد کے سست ہونے کی وجہ سے تھا ، یا یہ (فاصبر صبرا جمیلا) سأل کے متعلق (یعنی معنوی ربط) ہے کیونکہ اس کا معنٰی ہے کہ عذاب کا واقع ہونا قریب ہے پس آپ ﷺ صبر فرمائے ، تحقیق آپ ﷺ انتقام کے قریب پہنچ گئے ہیں (یعنی آپ ﷺ مکہ المکرّمہ سے مدینہ منورہ ہجرت فرما جائیں گئے اور جنگ بدر واقع ہوگئی)

﴿اِنَّهُمۡ يَرَوۡنَهٗ﴾

[کفار کو تو یہ نظر آتا ہے] (ہ) ضمیر عذاب کے لیے ہے (کی طرف لوٹ رہی ہے) یا یوم قیامت کے لیے

﴿بَعِيۡدًا﴾

[بہت دور] ممکن ہونے سے (ممکن ہونے کا گمان بھی نہیں کرتے تھے)

﴿وَّنَرٰٮهُ قَرِيۡبًا﴾

[(لیکن) ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں] ممکن ہونے سے یا اس کے واقع ہونے سے (منہ کی ضمیر الامکان کی طرف لوٹ رہی ہے)

﴿یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ کَالۡمُهۡلِ﴾

【اس روز آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوگا】(یہ جملہ) قریبا (شبہ فعل) کے لیے ظرف ہے اس روز قیامت کا ہونا ممکن ہے جس دن آسمان پگھلی ہوئی دھات کی مانند ہوں گے یا مضمر کے لیے ظرف ہے جس پر ''واقع'' کا لفظ دلالت کرتا ہے (یعنی اس سے پہلے ''یقع''، فعل محذوف ہے اور یہ جملہ اس کا مفعول فیہ بنے گا) یا فی یوم (کے لفظ) سے بدل (فی یوم مبدل منہ اور یوم بدل) ہے اگر اس کا تعلق (سأل) کے ساتھ قائم کیا جائے وہ دھات جس کو آہستگی کے ساتھ پگھلا جاتا ہے جیسے دھاتیں اور تیل کی تلچھٹ وغیرہ (کچھ دھاتیں فوراً پگھل جاتی ہیں جیسے سونا، چاندی جبکہ کچھ دھاتیں آہستہ آہستہ پگھلتی ہیں جیس لوہا وغیرہ) (مُهل : پگھلی ہوئی دھات کو کہتے ہیں

﴿وَتَکُوۡنُ الۡجِبَالُ کَالۡعِهۡنِ﴾

【اور پہاڑ رنگ برنگی اُون کی مانند ہوگئی】اس اون کی طرح جو مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی ہوگی

سوال: جواب: (سوال)

مختلف رنگوں کی کیوں ہوگئی؟

سوال: جواب: (جواب)

کیونکہ پہاڑوں کے رنگ گونا گوں ہوتے ہیں اس لیے ان کو ''عھن'' کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ پس جب انہیں پھلایا جائے گا اور ہوا میں اڑا دیا جائے گا تو اس دھنی ہوئی رنگین اُون کے مشابہہ ہو جائیں گے جب ہوا اس (اُون) کو اڑا دے۔ (اَلۡعِهۡن: وہ اون جو مختلف رنگوں سے رنگی ہوئی ہو)

﴿وَلَا یَسۡـَٔلُ حَمِیۡمٌ حَمِیۡمًا﴾

【اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کس حال نہیں پوچھے گا】اور کوئی قریبی (دوست) کسی (بھی قریبی دوست) کی حالت کے متعلق سؤال نہیں کرئے گا اور ابن کثیر (مکی) نے مجہول کی بناء پر اسے لا یُسۡئَلُ پڑھا ہے یعنی کسی قریبی (دوست) سے اس کے قریبی (دوست) کے حال کے متعلق سؤال نہیں کیا جائے گا۔ (الحمیم: ادنیٰ درجہ کے دوست کو نہیں کہتے بلکہ آپ کا وہ دوست جس کا آپ کو از حد خیال رہتا ہے۔ اس کی کسی حالت سے آپ بے پروائی اور بے رخی اختیار نہیں کر سکتے)

﴿یُّبَصَّرُوۡنَهُمۡ﴾

【دکھائی دیں گئے ایک دوسرے کو】یہ جملہ مستأنفہ ہے

سوال: جواب: (سوال)

کیا ایک دوست دوسرے دوست کو دیکھ نہی رہا ہوگا جس کی وجہ سے وہ اس کے بارے میں سوال نہیں کرئے گا

سوال: جواب: (جواب)

دوست ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہونگیں لیکن وہ اس نفسی نفسی کے عالم میں اپنی حالت میں متفکر ہونگے جس کی وجہ سے وہ کسی دوست کی حالت کے بارے میں دریافت نہیں کرئیں گے۔ یا (ترکیب کلام میں) حال واقع ہو رہا ہے جو اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ سوال سے مانع (یعنی سوال نہ کرنا) (اپنی حالت میں) مشغول ہونے کی بناء پر ہوگا نہ (کہ کسی) پوشیدگی کی وجہ سے۔ یا مشاہدہ حال سوال کرنے سے مستغنی کر دیتا ہے جیسے چہروں کا سیاہ وسفید ہونا (یعنی جو اچھے لوگ ہونگے ان کے چہرے سفید ہونگے اور گناہگاروں کے چہرے سیاہ ہونگے، ان حالتوں کو دیکھنے کے بعد وہ کسی کے متعلق سؤال نہیں کرئیں گئے) حمیم کے عموم (نکرہ) کی وجہ سے ضمیروں (یبصرونھم میں ''واو جمع اور ''ہ'') کو جمع کیا گیا ہے (جب کوئی اسم نکرہ کے تحت داخل ہو تو وہ عموم پر دلالت کرتا ہے)

﴿یَوَدُّ الۡمُجۡرِمُ لَوۡ یَفۡتَدِیۡ مِنۡ عَذَابِ یَوۡمِئِذٍۭ بِبَنِیۡهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِیۡهِ﴾

[ہر مجرم تمنا کرئے گا کہ کاش ! بطور فدیہ دے سکتا آج کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنے بیٹوں کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائیوں کو] (یبصرونھم میں ''واو جمع یا ضمیر'') (دونوں میں سے کسی ایک سے) حال واقع ہورہا ہے یا یہ جملہ مستانفہ ہے جو دلالت کرتا ہے کہ ہر آدمی اپنے نفس میں اتنا مشغول ہونا اس حدتک ہوگا کہ وہ تمنا کرئے گا کہ لوگوں میں سے محبوب ترین اوران لوگوں کو بطور فدیہ دے (کر آج کے اس ہولناک عذاب سے بچ جائے) جو اس کے دل کے ساتھ چمٹے ہوئے ہیں، چہ جائیکہ وہ اپنے قریبی کا اہتمام (خیال) کرئے اور ان (کے) متعلق سؤال کرئے۔ اور (لفظ) عذاب کو تنوین کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور یَوْمِئِذٍ کو نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے کیونکہ یہ تعذیب کے معنٰی میں ہے (یعنی جب یوم کو تنوین کے ساتھ پڑھیں گئے تو یوم منصوب ہوگا اور عذاب کا مفعول بنے گا کیونکہ عذاب، تعذیب کے معنٰی میں ہے اور مصدر اپنے فعل کی طرح عمل کرتا ہے)

﴿وَفَصِيلَتِهِ﴾

[اور اپنے خاندان کو] اور اپنے خاندان کو جن سے وہ جدا ہوا

﴿الَّتِي تُئْوِيهِ﴾

[(جو ہر مشکل میں) اسے پناہ دیتا تھا] جو اس کو نسب اور سختیوں کے وقت اپنے ساتھ ملا لیا کرتے تھے

﴿وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾

[اور (بس چلے تو) جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو] جن وانس میں سے یا (تمام) مخلوقات میں سے

﴿ثُمَّ يُنْجِيهِ﴾

[پھر یہ (فدیہ) اس کو بچالے] اس جملہ کا یفتدی پر عطف ہے۔ یعنی کاش یہ فدیہ دینا اسے (عذاب سے) نجات دلا دے اور ثم اس کو بعید جاننے کے لیے ہے (یعنی ثم اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازی معنٰی میں استعمال ہورہا ہے یعنی تراخی زمانہ کے لیے نہیں ہے بلکہ تَرَاخِيِ رُتَبِي کے لیے ہے)

﴿كَلَّا﴾

[(لیکن) ایسا ہر گز نہ ہوگا] مجرم کو اظہار محبت (خواہشات سے روکنا ہے) جھڑکنا ہے۔ (حروف کلّا کی دو قسمیں ہیں جب اس سے پہلے ایسا کلام ہو جس سے جھڑکنا مقصود ہو تو کلّا، رَدْع کے معنٰی میں ہوگا اور اگر اس سے پہلے ایسا کلام موجود نہ ہو تو کلّا، الا، نعم، بلیٰ کے معنٰی میں ہوگا) اور یہ (اس بات پر) دلالت کرتا ہے کہ فدیہ دینا اس کو نجات نہیں دئے گا۔

﴿إِنَّهَا﴾

ھا ضمیر کا مرجع آگ ہے یا یہ ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر لظی بیان کررہا ہے

سوال: جواب: (سوال)

یہاں آگ کا تو لفظ مذکور ہی نہیں تو پھر یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ آگ کی طرف راجع ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کبھی کبھی مرجع الفاظ میں مذکور نہیں ہوتو بلکہ کلام کے سیاق وسباق سے سمجھا جاتا ہے چونکہ پہلے عذاب کا ذکر ہورہا ہے اس لیے اسکا مرجع آگ ہے

﴿لَظَى﴾

[بے شک آگ بھڑک رہی ہوگئی] لظیٰ اس کی خبر ہے، یا بدل ہے یعنی ھا ضمیر مبدل منہ ہے اور لظیٰ بدل ہے

سوال: جواب: (سوال)

مبدل منہ اور بدل میں مطابقت ضروری ہوتی ہے، جبکہ مبدل منہ معرفہ اور بدل نکرہ ہے، یہاں مطابقت کیوں نہیں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کبھی کبھی بدل بغیر صفت کے بھی آجاتا ہے یا ھا ضمیر،ضمیر قصہ ہے اور لظیٰ مبتداء ہے او رنَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی اسکی خبر ہے۔ ﴿نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰی﴾

(نوچ لےگئی گوشت پوست کو)اور وہ (لظیٰ) خالص آگ کا انگارہ ہے۔اور کہا گیا ہے کہ(لظیٰ) آگ کا عَلَمْ ہے جو الظیٰ ، سے **اللھب** کے معنی میں منقول ہے۔امام حفص نے اسے (**نزاعة**) عاصم (بھدلہ کوفی) سے نزاعۃً نصب کے ساتھ روایت کیا ہے،اختصاص کے طور پر یا حال مؤکدہ کی بناء پر یا حال منتقلہ کی بناء پر اس بات پر دلالت کرنے کے لیے کہ لظیٰ بمعنٰی متلظیة ہے(اختصاص سے مراد یہ ہے کہ اس سے پہلے اخص، اعنی (فعل)وغیرہ محذوف ہے)

(حال مؤکدہ: جس کا معنٰی ماقبل کے بغیر بھی مستفاد ہوتا ہے یعنی اس کا معنی پہلے ہی موجود ہوتا ہے حال کو تاکید کے لیے لایا جاتا ہے)

(حال منتقلہ :جس کا معنٰی ماقبل کے بغیر مستفاد نہیں ہوتا)

اور الشــوی جسم کے اطراف کو کہتے ہیں (ہاتھ،پاؤں وغیرہ) یا **الشـوی** ، **''شواۃ''** کی جمع ہے اور **''شواۃ''** سر کی کھال کو کہتے ہیں ۔دونوں ہاتھوں ،دونوں پاؤں اور اطرافِ جسم،جن پر ضرب لگنے سے انسان کی موت واقع نہیں ہوتی 'ان کو بھی **''شواۃ''** کہا جاتا ہے اور انسان کی ساری ظاہری کھال کو بھی **''شواۃ''** کہتے ہیں(تاج العروس) قرطبی نے ضحاک سے نَزَّاعَةً لِلشَّوٰی کا یہ معنی بھی لکھا ہے یہ ایسی آگ ہوگئی جو انسن کے گوشت پوست کو ہڈیوں سے اُدھیڑ لے گی

﴿تَدۡعُوۡا﴾

(وہ بلائے گئی) کھینچے گئی اور حاضر کرے گئی جس طرح (شاعر) ذوالرمة کا قول ہے تـدعـو أَنفه الرِبَبُ (خوشبودار اس کی ناک کو کھینچتی ہے) یہ اس کو کھینچنے اور جذب کرنے سے مجاز ہے جو اس سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اور کہا گیا ہے کہ جہنم کے داروغے اسے پکاریں گئے اور یہ بھی قول ہے کہ تدعو کا معنی تھلک ہے اور یہ معنی عربوں کے اس قول سے ماخوذ ہے دعـا ہ اللہ ُاذا اھلکھا (یہ قول اس وقت بولا جاتا ہے جب کسی کی موت قریب ہو) آگ ان لوگوں کو بلائے گی' کہے گئی۔(**اِلَیَّ یا مُشْرِكُ** ،**اِلَیَّ یا مُنَافِقُ** ادھر آؤ۔اے مشرک۔ادھر آؤ۔اے منافق)

﴿مَنۡ اَدۡبَرَ﴾

(جس نے پیٹھ پھیری) حق سے

﴿وَ تَوَلّٰی﴾

(اور منہ موڑا تھا) (اللہ) کی اطاعت سے

﴿وَجَمَعَ فَاَوۡعٰی﴾

(اور وہ مال جمع کرتا رہا پھر اسے سنبھال سنبھال کر رکھتا رہا) اور مال کو جمع کیا اس نے اس کو برتن میں (سینت سینت کر) رکھا اور رپھر اسے خزانہ کیا لالچ ،لمبی امید کرتے ہوئے

﴿اِنَّ الۡاِنۡسَانَ خُلِقَ هَلُوۡعًا﴾

(بے شک انسان بہت لالچی پیدا ہوا ہے) شدید لالچی،تھوڑے صبر والا

﴿اِذَا مَسَّهُ الشَّر﴾

(جب اسے تکلیف پہنچے تو) نقصان

﴿جَزُوۡعًا﴾ (سخت گھبرا جانے والا) وہ جزع،فزع کو ذیادہ کر دیتا ہے

﴿وَّاِذَا مَسَّهُ الۡخَيۡرُ﴾

(اور جب اسے دولت تو) خوشحالی

﴿مَنُوۡعًا﴾

﴿حد درجہ بخیل﴾ روکنے میں مبالغہ کرتا ہے تینوں اوصاف (ھلوعا ،جزوعا،منوعا) حال مقدرہ ہیں یا محققہ ہیں کیونکہ یہ ایسی طبیعتیں ہیں جن پر انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

پہلا''اذا'''' جزوعا'' کے لیے اور دوسرا''اذا''منوعا کے لیے ظرف ہے

(حال مقدرہ: وہ حال ہے جس میں فعل اور اس کے عامل کا زمانہ ایک نہ ہو) (حال محققہ: وہ حال ہے جس میں فعل اور اس کے عامل کا زمانہ ایک ہو)

(ھلوع: ایسا حریص جو حلال وحرام کی تمیز نہیں کرتا)

(جزوع: جزع، سے مبالغہ کا صیغہ ہے: جزع فزع زیادہ کرنے والا)

(منوع: سخت کنجوس، سخت بخیل)

﴿اِلَّا الۡمُصَلِّيۡنَ﴾

﴿بجز ان نمازیوں کے﴾ مذکورہ صفات کے ساتھ جو لوگ متصف ہیں ان کے لیے استثناء ہے (کن سے) جو اس سے پہلے مذکورہ صفات پر پیدا کیے گئے ہیں

سوال: جواب: (سوال)

یہ استثناء کیوں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کہا گیا ہے یہ صفات متضاد ہیں ان صفات کے لیے جو ذکر ہو چکی ہیں اس حثیت سے کہ یہ اللہ کی اطاعت میں مستغرق رہنے پر، مخلوق پر شفقت کرنے پر ،یوم جزاء پر ایمان رکھنے، عاقبت (انجام) کے خوف پر، شہوت کے توڑنے پر، آخرت کو دنیا پر ترجیح دینے پر دلالت کرتی ہیں۔اور یہ صفات (ھلوعا، جزوعا، منوعا) دنیا کی محبت میں منہمک ہونے اور اس پر غور وفکر میں کوتاہی کرنے سے پیدا ہوتی ہیں

﴿الَّذِيۡنَ هُمۡ عَلٰى صَلَاتِهِمۡ دَآئِمُوۡنَ﴾

﴿جو اپنی نماز پر پابندی کرتے ہیں﴾ کوئی مشغول کرنے والا انہیں (نماز سے) غافل نہیں کرتا

﴿وَالَّذِيۡنَ فِىۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ﴾

﴿اور وہ جن کے مالوں میں مقررہ حق ہے﴾ جیسے زکوٰۃ اور مقررہ صدقات

سوال: جواب: (سوال)

سورۃ معارج تو مکی ہے اور زکوۃ کا حکم تو مدینہ میں نازل ہوا پھر زکوۃ سے کیا مراد ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

مکۃ المکرّمہ میں کچھ صدقات مقرر تھے یہاں زکوۃ سے مراد وہ صدقات ہیں

﴿لِّلسَّآئِلِ﴾

﴿سائل کے لیے﴾ اس (شخص) کے لیے جو سوٴال کرتا ہے

﴿وَالۡمَحۡرُوۡمِ﴾

﴿اور محروم کے لیے﴾ اس (شخص) کے لیے جو سوٴال نہیں کرتا۔پس اسے غنی گمان کیا جاتا ہے اور محروم کر دیا جاتا ہے

﴿وَالَّذِيۡنَ يُصَدِّقُوۡنَ بِيَوۡمِ الدِّيۡنِ﴾

﴿اور جو تصدیق کرتے ہیں روز جزا کی﴾ اپنے اعمال کے ساتھ (یوم جزاء کی) تصدیق کرتے ہیں (کس طرح تصدیق کرتے ہیں؟) اور وہ اپنے نفس کو (اللہ کی عبادت میں) تھکاتے ہیں اور اپنا مال اخروی ثواب کی طمع میں (اللہ کی راہ مین) خرچ کرتے ہیں۔ اس وجہ سے دین کو ذکر کیا گیا ہے (دین کا معنیٰ جزا کا دن ہے نہ کہ فرماں برداری کا)

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ﴾

﴿اور جو اپنے رب کے عذاب سے ہمیشہ ڈرنے والے ہیں﴾ وہ اپنے نفسوں (جانوں) پر ڈرنے والے ہیں

﴿اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْن

﴿بے شک ان کے عذاب نڈر ہونے کی چیز نہیں﴾ یہ جملہ معترضہ ہے (اور اس بات پر) دلالت کرتا ہے کہ کسی ایک کو بھی (یہ بات) زیبا نہیں کہ وہ اللہ کے عذاب سے امن میں ہو (خواہ کتنی ہے اطاعت کرئے) اگرچہ وہ اس کی اطاعت میں مبالغہ کرئے (انتہاء کردے)

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾

﴿اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں بجز اپنی بیویوں کے یا اپنی کنیزوں کے تو ان پر کوئی ملامت نہیں البتہ جو خواہش کریں گے ان کے علاوہ تو وہی لوگ حد سے بڑھنے والے ہیں﴾ اس آیت کی تفسیر سورہ المؤمنین میں گزر چکی ہے

(یعنی مشت زنی، یا کسی اور طرح سے شہوت کو ختم کرنے والے لوگ، یہ حد کو تجاوز کرنے والے ہیں)

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْن﴾

﴿اور جو اپنی امانتوں اور عہدو پیان کی پاسداری کرتے ہیں﴾ وہ عہدو پیان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اور ابن کثیر (مکی) نے اسے لامانتھم پڑھا ہے (مفرد پڑھا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور مصدر تمام جنس کا احتمال رکھتا ہے)

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ﴾

﴿اور جو لوگ اپنی گواہیوں پر قائم رہنے والے ہیں﴾ وہ انکار نہیں کرتے اور حقوق اللہ اور حقوق العباد میں سے جن چیزوں کا انہیں علم ہو جاتا ہے انہیں نہیں چھپاتے (لا یخنون عبارت نہیں ہے بلکہ لایخفون ہے) یعقوب (حضرمی بصری) اور امام حفص نے اسے انواع کے اختلاف (یعنی شہادات کے انواع کے مختلف ہونے کی) وجہ سے بشھاداتھم پڑھا ہے (امام بیضاوی کی قرأت صیغہ واحد کے ساتھ بشھادتھم ہے) (عام طور پر مصدر کی جمع نہیں لائی جاتی کیونکہ مصدر قلت و کثرت پر دلالت کرتا ہے، لیکن جب مصدر مختلف اقسام (انواع) پر دلالت کرئے تو اس کی جمع بنالیتے ہیں

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾

﴿اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں﴾ وہ نماز کی شرائط کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کے فرائض اور سنتوں کو مکمل کرتے ہیں

سوال: جواب: (سوال)

جب نیک لوگوں کا ذکر شروع کیا ان کی صفات میں سے سب سے پہلے نماز کو ذکر کیا اور اب اختتام پر بھی نماز کا ہی ذکر کیا اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

نماز کو مکرر ذکر کرنا اور ان (نمازیوں) کو نماز کی صفت کے ساتھ متصف کرنا اولاً اور آخراً دو اعتبار سے نماز کی فضیلت پر دلالت کرنے کے لیے ہے اور (دیگر فرائض پر) نماز کے شرف کو بیان کرنے پر دلالت کرنے کے لیے ہے اور نماز کی اس عبارت میں کچھ ایسے مبالغات ہیں جو مخفی نہیں ہیں (نظم کا معنیٰ ''پرونا'' ہوتا ہے لیکن یہاں ''عبارت'' مراد ہے) (یہاں اسم موصول کو ذکر کیا گیا ہے جو کہ موصوف، صفت پر مشتمل ہے، ''ھم'' ضمیر فصل ہے جو کہ مزید پختگی پر دلالت کرنے کے لیے ذکر کی گئی ہے۔ جار مجرور (علی صلواتھم) کو مقدم کیا ہے جس سے حصر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے)

﴿اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ﴾

[یہی لوگ مکرم ومحترم ہوں گئے جنتوں میں] (کس طرح) اللہ تعالیٰ کے ثواب کے ساتھ

﴿فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ﴾

[پس ان کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ آپ کی طرف ٹکٹکی باندھے] آپ کے اردگرد

﴿مُهْطِعِيْنَ﴾

[بھاگے چلے آرہے ہیں] جلدی کرتے ہوئے (مھطعین: یعنی آپ کی طرف متوجہ ہوکر بڑی تیزی سے آرہے ہیں)

﴿عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ عِزِيْنَ﴾

[ایک گروہ دائیں طرف سے اور دوسرا گروہ بائیں طرف سے] مختلف فرقے ہیں۔(عزین) عِزَۃ کی جمع ہے اور اس کی اصل عِزْوَۃ ہے (واو کی حرکت نقل کرکے ماقبل کو دی اور واو کو حذف کردیا) جو العزو سے ماخوذ ہے (عزین: ٹولیاں ٹولیاں، گروہ درگروہ) اور ان میں سے ہر فرقہ دوسرے کی طرف منسوب ہوتا جس طرف دوسرا منسوب ہوتا اور مشرکین نبی پاک ﷺ کے گرد حلقہ بنالیتے تھے اور آپ ﷺ کے کلام کا مزاق اڑایا کرتے تھے

﴿اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ جَنَّةَ نَعِيْمٍ﴾

[کیا طمع کرتا ہے ان میں سے ہر شخص کہ (ایمان واطاعت کے بغیر) نعمتوں بھری جنت میں اسے داخل کیا جائے گا] بغیر ایمان کے (ان میں سے ہر آدمی طمع کرتا ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے گا) اور یہ کفار کہ قول کا انکار کرنا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ جو محمد ﷺ فرماتے ہیں اگر یہ صحیح ہو گیا تو پھر بھی ہم جنت میں/آخرت میں ازروئے نصیب مسلمانوں سے افضل ہونگے جس طرح کہ ہم دنیا میں (افضل ہیں)

﴿كَلَّا﴾

[ہرگز نہیں] یہ (کفار) کو اس طمع سے جھڑکنا ہے

﴿اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ﴾

[ہم نے ان کو پیدا کیا ہے اس (مادہ) سے جسے وہ بھی جانتے ہیں] یہ اس کے لیے تعلیل ہے (اس آیت مبارکہ کے ساتھ ان کے طمع کرنے کی تعلیل پیش کی جارہی ہے) اور معنٰی یہ کہ تمہیں گندے نطفہ سے پیدا کیا گیا ہے جو عالم قدس کے مناسب نہیں۔ پس جس نے اپنے آپ کو ایمان واطاعت کے ساتھ مکمل نہیں کیا اور (اپنے آپ کو) اخلاق ملکیہ کے ساتھ مزین نہیں کیا تو پس اس نے اپنے آپ کو جنت میں داخل ہونے کے لیے تیار نہیں کیا۔ یا تمہیں ایسی چیز کے ساتھ پیدا کیا گیا ہے جس کو تم جانتے ہو اور وہ نفس کو علم وعمل کے ساتھ مکمل کرنا ہے۔ جس نے خود کو علم وعمل کے ساتھ مکمل نہیں کیا تو اس نے کاملین کی منازل میں کوئی ٹھکانہ نہیں بنایا

-

یا یہ ان کو اس طمع سے جھڑکنے کے بعد نشأۃ اولی کے ساتھ نشأۃ ثانیہ کے ممکن ہونے پر استدلال کرنا ہے وہ نشاۃ ثانیہ جس کی فرضیت پر انہوں نے اپنے طمع کی بنیاد رکھی جو فرضیت ان کے نزدیک محال ہے

﴿فَلَآ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ﴾

[پس میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے رب کی کہ ہم پوری قدرت رکھتے ہیں کہ ان کے بدلے میں بہتر لوگ لے آئیں]

(سوال) سوال: جواب:

قرآن میں ایک جگہ اللہ نے فرمایا ''رب المشرقین والمغربین'' ''اور رب المشرق والمغرب'' ''رَبَّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِب'' ------؟

(جواب) سوال: جواب:

ایک مشرق اور ایک مغرب، اس اعتبار سے '' رب المشرق والمغرب '' فرمایا

شمال مشرق اور جنوب مشرق اسی طرح شمال مشرق اور جنوب مشرق، اس اعتبار سے '' رب المشرقین والمغربین '' فرمایا

مشرق سے ہر روز سورج ایک نئی سمت سے نکلتا ہے اس اعتبار سے بہت سے مشرق بن جاتے ہیں اور ہر روز مغرب میں مختلف سمتوں میں غروب ہوتا اس اعتبار سے بہت سے مغرب اس لیے فرمایا"رَبّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِب"

یعنی ہم انہیں ہلاک کر دئے اور ان سے بہتر مخلوق لے آئیں یا ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے بدلے ایسے اصحاب عطا کریں جو تم سے بہتر ہو گئے اور وہ انصار ہیں

﴿وَمَا نَحۡنُ بِمَسۡبُوۡقِیۡنَ ﴾

(اور ہم ایسے کرنے سے عاجز نہیں) اگر ہم ارادہ کریں تو ہم مغلوب نہیں ہیں

(مسبوق: اس کو کہتے ہیں جس کا کوئی مدمقابل پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل جائے، یہ عجز و کمزوری کی علامت ہے فرمایا! ہم عاجز و کمزور نہیں)

﴿فَذَرۡهُمۡ یَخُوۡضُوۡا وَیَلۡعَبُوۡا حَتّٰی یُلٰقُوۡا یَوۡمَهُمُ الَّذِیۡ یُوۡعَدُوۡنَ﴾

(سو آپ رہنے دیجیے انہیں کہ (خرافات میں) مگن رہیں اور کھیلتے رہیں حتٰی کہ وہ ملاقات کریں اپنے اس دن سے جس کس ان سے وعدہ کیا گیا ہے) اس کی تفسیر **سورۃ الطور** کے آخر میں گزر چکی ہے

﴿یَوۡمَ یَخۡرُجُوۡنَ مِنَ الۡاَجۡدَاثِ سِرَاعًا﴾

(اس روز نکلیں گئے (اپنی) قبروں سے جلدی جلدی) جلدی کرتے ہوئے، یہ سریع کی جمع ہے (اجداث، جدث کی جمع ہے جس کا معنیٰ ہے قبر)

﴿کَاَنَّهُمۡ اِلٰی نُصُبٍ﴾

(گویا وہ اپنے بتوں کے) استھانوں کی طرف) جنہیں (عبادت کے لیے) نصب کیا گیا تھا (جس طرح وہ عبادت کے لیے بت خانوں کی طرف بھاگا کرتے تھے اس طرح)۔ یا علم کے طور پر (جھنڈے) (پرانے وقتوں میں دیہاتوں، ویرانوں وغیرہ میں جھنڈے وغیرہ نصب کئے جاتے تھے جنہیں دیکھ کر راہ بھولا مسافر اپنا درست راستہ پا لیتا تھا جب وہ اس جھنڈے کو دیکھتا تھا تو فوراً اس کی طرف بھاگ اٹھتا تھا)

﴿ یُوۡفِضُوۡنَ﴾

(دوڑے جا رہے ہیں) وہ تیزی سے بھاگ رہے ہوں گئے۔ ابن عامر (شامی) اور امام حفص نے نون اور صاد کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور سبعہ میں سے باقی قراء نے نَصْبٍ نون کے فتح اور صاد کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ نُصُبٍ کی تخفیف ہے یا جمع ہے

﴿ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ﴾

(جھکی ہوں گئی ان کی آنکھیں چھا رہی ہو گی ان پر ذلت) اس کی تفسیر گزر چکی ہے

﴿ذٰلِكَ الۡیَوۡمُ الَّذِیۡ كَانُوۡا یُوۡعَدُوۡنَ﴾

(یہی وہ دن ہے جس کا ان سے وعدہ کے گیا ہے) دنیا میں

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس نے سورہ سأل سائل پڑھی اللہ اس کو ان لوگوں کا ثواب عطا فرمائے گا جو اپنی امانتوں اور عہدوں کی پاسداری کرتے ہیں

سورۃ نمبر	سورہ النوح	بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ	کل آیات

﴿اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِهٖۤ اَنۡ اَنۡذِرۡ﴾

(بے شک ہم نے بھیجا نوح کو ان کی قوم کی طرف (اور فرمایا اے نوح!) بروقت خبردار کر و اپنی قوم کو) امام بیضاوی "بأن أنذر" سے اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ "بأن" سے پہلے حرف جار محذوف ہے اور اَن مصدریہ ہے

سوال: جواب: (سوال)

یہاں حرف جار کیوں محذوف ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

ارسل یرسل ارسالا فعل دوسرے مفعول کی طرف کسی واسطہ کے بغیر متعدی نہیں ہوتا اس لیے حرف جار کو محذوف نکالا ہے یعنی معنی ہوگا ہم نے نوح علیہ السلام کو ڈرانے کے ساتھ ان کی قوم کی طرف بھیجا۔ "بأن قلنا" سے اس جانب اشارہ ہے کہ "ان مصدریہ"، فعل انذر پر داخل نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد قول محذوف ہے اور اصل عبارت یوں ہوگئی

اِنَّآ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖٓ بأن قلناله اَنْ اَنْذِرْ

قلناله قول ہے اور "اَنْ اَنْذِرْ" مقولہ ہے یعنی یہ ہوگا کہ ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف بھیجا اس طرح کہ ہم نے ان سے کہا کہ آپ اپنی قوم کو ڈرائیں

اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ اَن مفسرہ ہو کیونکہ ارسال اپنے ضمن میں قول کا معنی لیے ہوئے ہے اور قول کے ارادہ پر ان کے بغیر بھی پڑھا گیا ہے (اس صورت میں "انذر" سے پہلے "قلنا" لفظ مقدر مانا جائے گا)

سوال: جواب: (سوال)

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ جب "أن" مفسرہ ہو تو اس سے پہلے ایسے فعل کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے جو قول کا معنی دے تو یہاں قول کا معنی کہا پایا جا رہا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

فعل ارسال اپنے ضمن میں قول کا معنی لیے ہوئے ہے

﴿قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ﴾

(اس سے پہلے کہ نازل ہوجائے ان پر عذاب الیم) عذاب آخرت سے یا طوفان سے

﴿قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ۔ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ﴾

(آپ نے فرمایا اے میری قوم! میں تمہیں صریح طور پر ڈرانے والا ہوں کہ عبادت کرو اللہ تعالیٰ کی اور اس سے ڈرو اور میری پیروی کرو) اس کی مثال سورہ الشعراء میں گزر چکی ہے

﴿يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ﴾

(وہ بخش دے گا تمہارے لیے تمہارے گناہ) تمہارے بعض گناہوں کو یعنی بعض ذنوبکم سے اس جانب اشارہ ہے کہ من بعضیہ ہے یعنی بعض ذنوبکم یعنی سے مراد وہ گناہ ہیں جو اسلام لانے سے قبل انہوں نے کیے تھے کیونکہ اسلام ان کو مٹا دیتا ہے پس اللہ تعالیٰ آخرت میں ان گناہوں کے ساتھ مواخذ نہیں فرمائے گا

﴿وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔﴾

(اور مہلت دے گا تمہیں ایک مقررہ میعاد تک)

اور یہ وہ طویل ترین مدت ہے جو ایمان واطاعت کی شرط کے ساتھ تمہارے لیے مقرر کی گی ہے

(اجل کی دو قسمیں ہیں) 1: اجل معلق یعنی مبرم یعنی 2: اجل غیر معلق یعنی

﴿اِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ﴾

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا مقررہ وقت) وہ مدت جسے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے مقدر فرمایا

﴿اِذَا جَآءَ﴾

(جب آجاتا ہے)

ایسی صورت پر جس پر اسے از روئے اجل مقرر کیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ جب لمبی مدت/طویل مدت آجائے

﴿ لَا يُؤَخَّرُ ﴾

(تو اسے مؤخر نہیں کیا جا سکتا) مہلت و تاخیر کے اوقات میں جلدی کرو

(یعنی توبہ استغفار کرو کیونکہ جو عذاب آنا ہے اسے مؤخر نہیں کیا جائے گا)

﴿ لَوْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴾

(کاش! تم حقیقت کو جان لیتے) اگر تم اہل علم وفکر سے ہوتے تو اس ﷺ جان لیتے (لو بمعنی لیت بھی بنا سکتے ہیں اس وقت معنی ہوگا کاش تم جان لیتے) (لعلمتم ذکر کر کے امام بیضاوی اس جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ لو شرطیہ ہے اور لعلمتم جزاء/ جواب شرط محذوف نکالے گئے ہے)

سوال: جواب: (سوال)

تعلمون فعل متعدی ہے پھر اسکا مفعول ذکر کیوں نہیں کیا؟

سوال: جواب: (جواب)

مفعول کو ذکر نہ کرنے سے عموم کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے یعنی کوئی بھی مفعول مراد لیا جا سکتا ہے اگر مفعول ذکر کیا جاتا تو صرف ایک چیز متعین ہو جاتی لیکن اب عموم کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے اور اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ قوم نوح دنیا کی محبت میں منہمک ہونے کی وجہ سے موت میں بھی شک کرنے لگے تھے

﴿ قَالَ رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ ﴾

(نوح نے عرض کی اے میرے رب! میں نے دعوت دی) ایمان کی طرف

﴿ قَوْمِیْ لَيْلًا وَّنَهَارًا ﴾

(اپنی قوم کو رات کے وقت اور دن کے وقت) یعنی ہمیشگی کے ساتھ

﴿ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ﴾

(لیکن میری دعوت کے باعث ان کے فرار (ونفرت) میں ہی اضافہ ہوا)

ایمان واطاعت سے فرار کا

سوال: جواب: (سوال)

یہاں فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی طرف کیوں نہیں کی گئی؟

سوال: جواب: (جواب)

یزد فعل کی نسبت دعا کی طرف کرنا اس کے سبب کی وجہ سے ہے

(یہاں البلاغۃ الواعظہ کے ایک قاعدہ کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ کبھی کبھی فعل کی نسبت اس کے سبب کی طرف کر دی جاتی ہے اور اس عمل کو مجاز عقلی کہتے ہیں) جیسے اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ آیتیں مؤمنین کے ایمان میں اضافہ کرتی ہیں

﴿ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ ﴾

(اور جب بھی میں نے انہیں بلایا) ایمان واطاعت کی جانب/طرف

﴿ لِتَغْفِرَ لَهُمْ ﴾

(تاکہ تو انہیں بخش دے)ایمان واطاعت کے سبب

سوال:جواب:(سوال)

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے دو چیزیں ایمان واطاعت کا ذکر کیا لیکن ''بسببہ'' کی عبارت میں مفرد کی ضمیر کیوں ذکر فرمائی؟

سوال:جواب:(جواب)**لم اجد بعدُ**

﴿جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِیْٓ اٰذَانِهِمْ﴾

((تو ہر بار)انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لی)اپنے کانوں کو دعوتِ سماعت سے بند کرلیا

﴿وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ﴾

(اور اپنے اوپر لپیٹ لیے اپنے کپڑے)میری دعوت سے بہت زیادہ ناپسندیدگی کی وجہ سے میری طرف کراہتِ نظر کی بناء پر اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانپ لیا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھ سکیں یا کہیں میں انہیں پہچان نہ لوں اور پھر ایمان کی طرف ان کو دعوت دوں سببیہ صیغہ طلب کے ساتھ تعبیر کرنا مبالغہ کی وجہ سے ہے غشا یغشو کو باب استفعال سے ذکر کیا گیا ہے اور باب استفعال میں طلب کے معنی پایا جاتا ہے، معنی ہوگا کہ وہ جلدی جلدی کپڑے طلب کرتے ہیں اور خود کو ڈھانپ لیتے ہیں

﴿وَاَصَرُّوْا﴾

(اور اَڑ گئے(کفر پر))انکار، کفر اور گناہ پر اڑ گئے۔یہ''**اصر الحمار علی العانة**'' سے مستعار لیا گیا ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب گدھا اپنے کانوں کو کھڑا کرلیا ور اپنی مادہ کی طرف متوجہ ہو

﴿وَاسْتَكْبَرُوا﴾

(اور اور متکبر بن گئے) میری اتباع سے

﴿اسْتِكْبَارًا﴾

(پرلے درجے کے)بہت زیادہ تکبر

﴿ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا۔ثُمَّ اِنِّیْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا﴾

(پھر(بھی)میں نے انہیں بلند آواز سے دعوت دی پھر انہیں کھلے بندوں میں بھی سمجھایا اور چپکے چپکے بھی انہیں(تلقین)کی)میں نے ایک دفعہ کے بعد دوسری مرتبہ دعوت دی جس طرح بھی میرے لیے دعوت دینا ممکن تھا

''ثم'' ان صورتوں کے تفاوت کے اظہار کے لیے ہے ''ثم'' اصل میں تو ترتیب مع تاخیر کے لیے آتا ہے لیکن یہاں ترتیب رتبی کے لیے آیا ہے یعنی بعض کو بعض کے لیے مؤخر کرنے کے لیے آیا ہے المختصر ''ثم'' اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہو رہا ہے کیونکہ بلند آواز سے دعوت دینا ''اسرار'' چھپ کر یا آہستہ آواز سے دعوت دینے سے زیادہ سخت/بلیغ/اچھا/عمدہ ہے، یا ''ثم'' تراخی رتبی کے لیے ہی آیا ہے یعنی بعض صورتوں کے بعض صورتوں سے مؤخر ہونے کو بیان کرنے کے لیے آیا ہے اور ''جھارا'' مفعول مطلق ہونے کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ یہ دعا کی دو قسموں میں سے ایک قسم ہے یا یہ مصدر محذوف کی صفت ہے جو کہ ''دعا جھارا'' کے معنی میں ہے اس وقت یہ مفعول کے معنی میں ہوگا یعنی ''مجاہرا'' یا ''جھارا'' حال وقع ہو رہا ہے پس اس وقت یہ ''مجاہرا'' اسم فاعل کے معنی میں ہوگا ''دعوت'' کی ''ت'' ضمیر ذوالحال اور ''مجاہرا'' حال بنے ہوگا

﴿فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ۔﴾

(پس میں نے کہا(ابھی وقت ہے)معافی مانگ لو اپنے رب سے)کفر سے توبہ کرنے کے ساتھ کفر سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ تعالی کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کرلو)

﴿اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴾

(بے شک وہ بہت بخشنے والا ہے)

توبہ کرنے والوں کو گویا جب نوح علیہ السلام نے نے انہیں عبادت کا حکم دیا تو انہوں نے کہا اگر ہم حق پر ہیں تو ہم اس مذہب کو کبھی نہیں چھوڑے گئیں اور اگر ہم غلط راستہ پر ہیں تو جس کی ہم نے نافرمانی کی وہ ہمیں کیونکر قبول فرمائے گا اور کیونکر ہم پر لطف وکرم فرمائے گا تو حضرت نوح علیہ السلام نے انہیں ایسی عبادت کا حکم دیا جو ان کے گناہوں کو ختم کردے گئی اور ان کی طرف نعمتوں کو کھینچ کر لائے گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اور کہا گیا ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کا اپنی قوم کو دعوت دینا اور قومِ نوح کا کفر پر اصرار کرنا طویل ہو گیا تو انہوں نے سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر چالیس سال تک بارش کو روک لیا اور ان کی عورتوں کے رحم کو بانجھ کر دیا پس اس نے آنے والی آیت میں جس طریقہ/ حالت پر تھے اس سے توبہ کرنے پر ان کا اس چیز پر وعدہ فرمایا

﴿يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا۔ وَّ يُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا﴾

(وہ برسائے گا تم پر موسلا دھار بارش۔ اور مدد فرمائے گا تمہاری اموال اور فرزندوں سے اور بنا دے گا تمہارے لیے باغات اور بنا دے گا تمہارے لیے نہریں) اسی وجہ سے بارش کی طلب میں استغفار مشروع ہے (امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک نماز استسقاء کی بجائے توبہ واستغفار کر کے بھی بارش طلب کی جا سکتی ہے) اور آسمان نیلی چھتری، بادل اور بارش تینوں یعنی یہ تینوں احتمال رکھتا ہے اور ''مدرار'' کا معنی بہت زیادہ برسنا/ بہنا ہے (اس بناء میں/ وزن میں مذکر و مؤنث برابر ہیں اور جنات سے مراد باغات ہیں)

﴿مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا﴾

(تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم پروا نہیں کرتے اللہ کی عظمت وجلال کی)

تم امید کیوں نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ اسے عزت عطاء فرمائے گا جس نے اس کی اطاعت وعبادت کی پس تم ایسی حالت پر ہو جاؤ جس میں تم یہ امید کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عزت عطا فرمائے گا اور للّٰه ''مؤقر'' کے لیے بیان ہے اگر اسے مؤخر کیا جائے تو یہ وقار کا صلہ ہوگا (یعنی اس کو وقار سے اس لیے مقدم کیا کہ عزت افزائی کرنا اور نعمتوں سے نوازنا اللہ تعالیٰ ہی کے شایان شان ہے)

﴿وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا﴾

(حالانکہ اس نے تمہیں کئی مرحلوں سے گزار کر پیدا کیا ہے) یہ یعنی یہ حال واقع ہو رہا ہے، انکار کو ثابت کرنے والا ہے اس طرح کہ مرحلہ در مرحلہ تخلیق تو رجاء کی موجب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کئی مرحلوں میں پیدا فرمایا کیونکہ پہلے یعنی انسان کو عناصر کی صورت میں بنایا پھر مرکبات کی صورت میں جو انسان کو غذا بہم پہنچاتے ہیں

پھر اخلاط کی تخلیق فرمائی پھر نطفہ بنایا اس کے بعد یعنی نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنایا پھر یعنی خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا پھر ہڈیاں اور گوشت بنایا پھر انہیں آخری شکل پر پیدا فرمایا۔ بے شک یعنی تخلیق کا عمل اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کہ اللہ تعالیٰ انہیں دوسری مرتبہ لوٹا دئے اور انہیں ثواب کے ساتھ عزت عطا فرمائے اور یہ مرحلہ در مرحلہ پیدا کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ عظیم قدرت والا اور مکمل حکمت والا ہے پھر اس آیۃ کریمہ کے بعد آفاق کی نشانیوں میں سے ایسی نشانیاں ذکر فرمائی جو اس امر یعنی مرنے کے بعد دوبارہ آٹھنے کی تائید کرتی ہیں چنانچہ فرمایا

﴿اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا﴾

(کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کیسے پیدا کیا ہے آسمانوں کو تہ بہ تہ۔ اور بنایا ہے چاند کو ان میں روشنی) یعنی ''فیھن'' کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں بتا رہے ہیں یعنی چاند کو آسمانوں میں روشنی بنایا اور چاند آسمان دنیا میں ہے

سوال: جواب: (سوال)

جب چاند آسمانِ دنیا میں ہے تو پھراس کی نسبت تمام آسمانوں کی طرف کیوں کی گئی ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

چاند کی نسبت سب آسمانوں کی طرف کرنا اس بناء پر ہے کہ ان تمام آسمانوں کے درمیان مماثلت ومناسبت موجود ہے

﴿ وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا ﴾

(اور بنایا ہے سورج کو (درخشاں) چراغ) سورج کو چراغ کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے

سوال: جواب: (سوال)

سورج کو چراغ کے ساتھ تشبیہ کیوں دی گئی ہے؟ جبکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ مشبہ بہ، مشبہ سے اقوی اور اظہر ہوتا ہے یعنی ہمیشہ کسی حقیر/چھوٹی چیز کو عظیم/بڑی چیز کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے جبکہ یہاں معاملہ برعکس کیوں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

یہاں تشبیہ مقلوب ہے اور تشبیہ مقلوب یہ ہے کہ مشبہ کو مشبہ بہ بنانا اس دعوی کی بناء پر کہ مشبہ، میں وجہ الشبہ زیادہ قوی اور ظاہر ہے۔ یہاں سورج کو چراغ کے ساتھ اس لیے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح چراغ اپنے اردگرد کی تاریکی کو زائل کر دیتا ہے اسی طرح سورج بھی زمین سے رات کی تاریکی کو زائل کر دیتا ہے

﴿وَاللّٰهُ اَنۡۢبَتَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ نَبَاتًا﴾

(اور اللہ نے تم کو زمین سے عجب طرح اُگایا ہے)

سوال: جواب: (سوال)

انشاء کے لفظ کو انبات کے ساتھ کیوں تعبیر کیا گیا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

انباء کے لفظ کو انشاء کے کے لیے مستعار لیا گیا ہے کیونکہ "الانباء" کا لفظ زیادہ حادث ہونے اور زمین سے بنائے جانے پر زیادہ دلالت کرنے والا ہے

(سوال) سوال: جواب:

یہاں "نباتا" مفعول مطلق واقع ہو رہا ہے اور آپ بخوبی جانتے ہیں کہ مفعول مطلق ماقبل فعل کا مصدر ہوتا ہے جبکہ یہاں ماقبل فعل باب افعال سے ہے اور "نباتا" مجرد ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اصل عبارت "انبتکم انباتا فنبتم نباتا" ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا پس تم پیدا ہو گئے، پس دلالت التزامیہ پر کتفاء کیا گیا ہے (مطلب یہ کہ پہلے جملہ سے مفعول مطلق کو حذف کر دیا اور دوسرے جملہ سے فعل کو حذف کر دیا)

پہلا جملہ: "انبتکم انباتا" جملہ سے مفعول مطلق "انباتا" محذوف ہے

دوسرا جملہ: "فنبتم نباتا" جملہ سے فعل "فنبتم" محذوف ہے

اور عبارت یوں ہوگئی "انبتکم من الارض نباتا"

﴿ثُمَّ يُعِيۡدُكُمۡ فِيۡهَا﴾

(پھر لوٹا دے گا اس میں اور) درآنحالیکہ تم قبروں میں چلے جاؤ گے

﴿وَيُخۡرِجُكُمۡ اِخۡرَاجًا﴾

((اسی سے) تمہیں (دوبارہ) نکالے گا) میدان حشر میں اور یہاں بھی فعل کو مفعول مطلق کے ساتھ مؤکدہ کیا اس بات پر دلالت

کرنے کے لیے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جانا متحقق ہے جس طرح ابتداء میں پیدا کیا جانا یقینی ہے اور یہ لامحالہ طور پر ہو کر رہے گا

﴿وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ بِسَاطًا﴾

(اور اللہ نے ہی زمین کو تمہارے لے فرش کی طرح بچھا دیا ہے) جس پر تم ادھر ادھر پھرتے / چہل قدمی کرتے ہو

﴿لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا﴾

(تا کہ تم اس کے کھلے راستوں میں چلو) یعنی کھلے / وسیع راستے اور ''فجاجا''، فج کی جمع ہے

سوال: جواب: (سوال)

سلک کا معنی ہے راستہ پر چلنا اور اس کا صلہ ''فی'' استعمال ہوتا ہے جبکہ یہاں ''من'' کے ساتھ مستعمل ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اس کا صلہ ''من'' اس لیے ذکر فرمایا کہ ''سلک'' فعل اپنے ضمن میں ''اتخاذ / پکڑ لینا'' کا معنی لیے ہوئے ہے یعنی ہو گا کہ تم زمین سے کھلے راستوں کو اختیار کرو

﴿قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ اِنَّهُمْ عَصَوْنِیْ﴾

(نوح نے عرض کی اے میرے پروردگار! انہوں نے میری نافرمانی کی) اس بات / احکام میں جن کا میں نے انہیں حکم دیا

﴿وَاتَّبَعُوْا مَنْ لَّمْ یَزِدْهُ مَالُهٗ وَوَلَدُهٗۤ اِلَّا خَسَارًا﴾

(اور اس کی پیروی کرتے رہے جس کو نہ بڑھایا اس کے مال اور اولد نے بجز خسارے کے) یعنی اپنے رؤسا / سرداروں کی پیروی کرتے رہے جو اپنے اموال پر تکبر کرنے والے تھے اور اپنی اولاد کے ساتھ دھوکہ میں مبتلا تھے اس طرح کہ یہ اشیاء ان کے لیے آخرت میں خسارے کا سبب بن گئی اور اس میں اس بات کی جانب بھی اشارہ ہے کہ انہوں نے رؤسا / سرداروں کی اتباع / اطاعت اس وجاہت کی وجہ سے کی جو انہیں مال واولاد کے سبب حاصل ہوئی اور یہی وجاہت انہیں گھاٹے کی طرف لے گئی امام ابن کثیر مکی، امام ابو عمرو بن العلا البصری، امام یعقوب حضرمی بصری، امام حمزہ بن الذیات الکوفی، امام علی بن حمزہ الکسائی الکوفی نے ''وُلْدُہ'' ضمہ وسکون کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ لغت ہے یا جمع ہے

لغت کی مثال جیسے ''حَزَن'' کو حُزْن'' جمع کی مثال جیسے اَسَد کی جمع ''اُسْد'' ہے

﴿وَمَكَرُوْا﴾

(اور انہوں نے مکروہ فریب کیے) یہ جملہ یزد پر عطف کیا گیا ہے

سوال: جواب: (سوال)

اگر ''مکروا'' کا عطف ''لم یزد'' پر ہے تو ''لم یزد'' کی ''ہ'' ضمیر مفعول واحد ہے جو اسم موصول ''من'' کی طرف لوٹ رہی ہے اس کا مطلب ہے کہ ''من'' سے شخصِ واحد مراد ہے تو پھر معطوف میں ''مکروا'' جمع کا صیغہ کیوں استعمال کیا گیا؟

سوال: جواب: (جواب)

''مَن'' میں جمع کا معنی پائے جانے کی وجہ سے جمع کی ضمیر کو ذکر کیا گیا ہے (یعنی ''مکروا'' میں واو جمع کی ضمیر ''من'' اسم موصول کی طرف ہی لوٹ رہی ہے اور جمع کی ضمیر معنی کے اعتبار سے ہے کیونکہ ''من'' واحد و جمع دونوں کے لیے آتا ہے)

﴿مَكْرًا كُبَّارًا﴾ (مکروہ فریب بڑے بڑے) انتہا میں بہت بڑا، ''کُبَّار''، ''کَبِیْر'' سے زیادہ بلیغ ہے (کیونکہ)

زیادۃ بناء تدل علی زیادۃ المعنی

الفاظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے
یعنی معنی میں تاکید حاصل ہوتی ہے

اوراس مکر سے مراد دین میں ان کا حیلہ کرنا ہےاور حضرت نوح علیہ السلام کوتکالیف دینے پرلوگوں کو برانگیختہ کرنا ہے

﴿ وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ ﴾

(اورئیسوں نے کہا(اے لوگو! نوح کے کہنے پر) ہرگز نہ چھوڑنا اپنے خداؤں کو) خاص طور پرانھیں نہ چھوڑنا اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ''ودا/سواعا/یغوث'' ان نیک لوگوں کے نام تھے جوحضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیانی عرصہ میں گزر گئے تھے۔ جب ''ودا/سواعا/یغوث'' انتقال کر گئے تو لوگوں نے ان سے تبرک حاصل کرنے کے لیے ان کی تصاویر بنالی جب ایک طویل مدت بیت گئی تو ان کی عبادت کی جانے لگی اور یہ عرب کی طرف منتقل ہو گئے اور ''ود'' قبیلہ ''کلب'' کا ایک بت تھا اور ''سواع'' قبیلہ ''ھمدان'' اور ''یغوث'' قبیلہ ''مذحج'' اور ''یعوق'' قبیلہ ''مراد'' اور ''نسر'' قبیلہ ''حمیر'' کا بت تھا

اور امام نافع مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ''وُدًّا'' ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور انہوں نے رَضِیَ اللہُ قبل اور مابعد کی مناسبت کرتے ہوئے تنوین کے ساتھ ''یغوثًا اور یعوقًا'' پڑھا ہے اور ان دونوں کا غیر منصرف ہونا علمیت کی بناء پر ہے

﴿وَقَدْ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا﴾

(انہوں نے گمراہ کر دیا بہت سے لوگوں کو) ''اَضَلُّوْا'' میں واو جمع کی ضمیر کا مرجع رؤسا/سردار ہیں یا بت ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد پاک ہے ''انھن اضللن کثیرا'' بے شک رَضِیَ اللہُ عَنْہُ نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کر دیا

سوال: جواب: (سوال)

''بت'' تو بے جان ہیں ان کی طرف گمراہ کی نسبت کرنا کیسے درست ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

درحقیقت انہیں بتوں نے تو نہیں گمراہ کیا بلکہ انہیں اپنے نفسوں کے برائیوں نے گمراہ کیا۔ یہاں فعل کی نسبت فاعل حقیقی کی بجائے اس کے سبب کی طرف کی گئی ہے

﴿ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا ضَلٰلًا ﴾

((الٰہی!) تُو بھی ان کی گمراہی میں اضافہ کر دے) اس آیت کا عطف ''رب انھم عصونی'' پر کیا گیا ہے

سوال: جواب: (سوال)

انبیاء کرام کو کیونکر زیب دیتا ہے کہ وہ گمراہی کے لیے بارگاہ خداوندی میں ملتجی ہوں؟

سوال: جواب: (جواب)

اور شاید کہ گمراہ سے مطلوب/مقصود ان کے مکر و فریب اور ان کی دنیاوی مصلحتوں کو تباہ و برباد کرنا ہے نہ کہ دینی امور میں رَضِیَ اللہُ کی گمراہ کو طلب کرنا ہے علیہ السلام اس گمراہی سے مراد ان کے مال واسباب کو ضائع کرنا ہے اور ان کو ہلاک کرنا ہے جس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے بے شک مجرمین گمراہی اور تنگی میں ہیں

﴿مِمَّا خَطِيْٓـئٰتِهِمْ﴾

(اپنی خطاؤں کے باعث) یعنی اپنی اپنی خطاؤں کی وجہ سے رَضِیَ اللہُ ''من'' تعلیلیہ ہے رَضِیَ اللہُ اور ''ما'' زائدہ برائے تاکید و تعظیم کے لیے ہے اور امام ابو عمرو بن العلا البصری نے ''مماخطایاھم'' پڑھا ہے

﴿ اُغْرِقُوْا ﴾

(انہیں غرق کر دیا گیا) طوفان کے ساتھ

﴿ فَاُدْخِلُوْا نَارًا﴾

(پھرانہیں آگ میں ڈال دیا گیا) نار سے مراد عذاب قبر یا عذابِ آخرت ہے

سوال: جواب: (سوال)

اگر آگ سے مراد عذابِ قبر ہو تو پھر ''ف'' عاطفہ اپنے حقیقی معنی میں مستعمل ہو رہی ہے یعنی ترتیب مع تعقیب کے لیے یعنی جب ایک کام کے فوراً بعد دوسرا کام ہو جائے تو اس وقت ''ف'' ذکر کی جاتی ہے یعنی ترجمہ ہوگا ''کہ انہیں غرق کرنے کے فوراً بعد آگ میں ڈال دیا گیا'' اور وہ آگ کا عذاب، عذابِ قبر ہی ہے لیکن اگر ''نارا'' سے مراد عذابِ آخرت لیا جائے تو پھر ''ف'' کی جگہ ''ثم'' کو ذکر کرنا چاہیے تھا جو کہ ترتیب مع تراخی کے لیے آتا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

تو قیب اس صورت میں اغراق (غرق کرنے) اور ادخال (آگ میں داخل کرنے) کے درمیانی عرصہ کو شمار نہ کرنے پر ہے یا (ف) ''اس لیے لائی گئی ہے کہ (یہ) سبب، سبب کے لیے معقب (پیچھے آنے والے) کی طرح ہے (یعنی جب سبب واقع ہو جائے تو اس کے پیچھے مسبب ضرور واقع ہوا کرتا ہے اگر چہ وقوع میں تاخیر ہو) اگر چہ اس میں کسی شرط کے مفقود ہونے یا کسی مانع کی موجودگی کی وجہ سے تاخیر ہو جائے اور ''نار'' کو نکرہ ذکر کرنا اس کی عظمت کے لیے ہے یا اس وجہ سے نکرہ ذکر کیا گیا ہے کہ اس نار سے مراد آگ کی ایک مخصوص نوع ہے جو ان کے لیے تیار کی گئی ہے

﴿ فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْصَارًا﴾

(پھر انہوں نے نہ پایا اپنے لیے اللہ کے سوا کسی کو مددگار) یہ ان کے لیے اشارہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا بتوں کو معبود بنایا جو ان کی مدد پر قادر نہیں

﴿وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا﴾

(نوح نے عرض کی اے میرے رب! نہ چھوڑ رُوئے زمین پر کافروں میں سے کسی کو بستا ہوا) ''دَيَّارًا'' بمعنی ''احدا'' یعنی کافروں میں سے کسی ایک کو بھی نہ چھوڑ، یہ ان اسماء میں سے ہے جو عام نفی میں استعمال ہوتے ہیں

اور ''دَيَّارًا'' دار سے یا الدور'' سے ''فَيْعَال'' کے وزن پر ہے۔ اور ''دَيَّار'' کی اصل ''دَيْوَار'' اس کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا گیا ہے جو ''سید'' کی اصل کے ساتھ کیا گیا۔ یہ ''فَعَّال'' کے وزن پر نہیں اگر ''فَعَّال'' کے وزن پر ہوتا تو ''دَوَّارًا'' ہوتا

﴿اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا﴾

(اگر تو نے ان میں سے کسی کو چھوڑ دیا تو وہ گمراہ کر دیں گے تیرے بندوں کو اور نہ جنیں گے مگر ایسی اولاد جو بڑی بدکار، سخت ناشکر گزار ہوگی) یہ بات حضرت نوح علیہ السلام نے اس وجہ سے فرمائی کہ آپ علیہ السلام نے انہیں آزمالیا تھا اور ساڑھے نو سو سال تک ان کے احوال کی چھان بین کر لی تھی چنانچہ آپ علیہ السلام ان کی عادات اور مزاجوں کو پہچان گئے تھے

﴿رَبِّ اغْفِرْلِيْ وَلِوَالِدَيَّ ﴾

(میرے رب! بخش دے مجھے اور میرے والدین کو) ملک بن متوشلخ اور شمخاء بنت انوش کو فرما دے اور دونوں مؤمنین تھے

﴿وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ ﴾

(اور اسے بھی جو میرے گھر میں ایمان کے ساتھ داخل ہوا) بیتی کے بارے میں تین احتمالات ہیں

1: میرے گھر میں　　2: میری مسجد میں　　3: میری کشتی میں

﴿مُؤْمِنًا وَّ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔﴾

(اور بخش دے سب مومن مردوں اور عورتوں کو) یوم قیامت تک

﴿وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا تَبَارًا﴾

(اور کفار کی کسی چیز میں اضافہ نہ کر بجز ہلاکت و بربادی کے) ہلاکت (تبارا کا معنی ہلاکت ہے)

سورۃ نمبر	سورہ الجن	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات

﴿قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ﴾

(آپ فرمایئے میری طرف وحی کی گئی ہے) اور اسے "اُحِيَ" پڑھا گیا ہے۔ اور اس کی اصل "وحی" ہے اور یہ "وُحِيَ اليه" سے ماخوذ ہے۔ پس "و" کو مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ سے بدل دیا گیا ہے اور اصل پر "وحی" بھی پڑھا گیا ہے اور "اَوحَى" کا نائب الفاعل "اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ" ہے

﴿اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ﴾

(کہ بڑے غور سے سنا ہے (قرآن کو) جنوں کی ایک جماعت نے) اور نفر تین سے لیکر دس تک کی درمیانی تعداد کو کہتے ہیں اور "جن" آنکھوں سے پوشیدہ ایسے اجسام عاقلہ ہیں جن پر عناصر ناریہ اور عناصر ہوائیہ غالب ہیں اور کہا گیا ہے کہ ارواح مجردہ کی ایک نوع کا نام "جن" ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ ایسے نفوس بشریہ ہیں جنہیں ان کے بدنوں سے جدا کر دیا گیا ہے اور اس میں اس چیز پر بھی دلالت ہے کہ حضور ﷺ نے نہ تو انہیں دیکھا اور نہ ہی ان پر قرأت کی اور حضور ﷺ کے قرأت کے بعض اوقات میں ان کا حاضر ہونا اتفاقی تھا پس انہوں نے اس قرآن کو سنا تو اللہ تعالیٰ نے اس چیز کی خبر اپنے رسول ﷺ کو دی

﴿فَقَالُوْا﴾

(پس انہوں نے (جا کر دوسرے جنات کو بتایا)) جب وہ اپنی قوم کی طرف لوٹے

﴿اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا﴾

(کہ ہم نے ایک قرآن سنا ہے) یعنی کتاب

﴿عَجَبًا﴾

(عجیب) عجیب، انوکھا جو کہ حسنِ نظم اور لطافت معنی میں لوگوں کے کلام سے جدا ہے۔ "عَجَبًا" مصدر ہے

سوال: جواب: (سوال)

مصدر تو صفت واقع نہیں ہوتا تو پھر یہاں مصدر صفت کیسے بن گیا؟

سوال: جواب: (جواب) بلاشبہ مصدر صفت واقع نہیں ہوتا مگر یہاں مبالغہ کے لیے اس کے ساتھ صفتِ قرآن بیان کی گی ہے

﴿يَّهْدِيْ اِلَى الرُّشْدِ﴾

(راہ دکھاتا ہے ہدایت کی) حق و ہدایت کی طرف/ جانب

﴿فَاٰمَنَّا بِهٖ﴾

(پس ہم (دل سے) اس پر ایمان لے آئے) پس ہم اس قرآن پر ایمان لے آئے ("ہ" ضمیر کے مرجع کے بارے میں بتا رہے ہیں)

﴿وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا﴾

(اور ہم ہرگز شریک نہیں بنائیں گے کسی کو اپنے رب کا) توحید پر دلائل قاطعہ کی وضاحت ہو جانے پر ہم ہرگز کسی کو اپنے رب کا شریک نہیں بنائیں گے

﴿وَّاَنَّهٗ تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا﴾

(اور بے شک اعلیٰ وارفع ہے ہمارے رب کی شان) ابن کثیر مکی، اور دونوں بصریوں رحمہما اللہ امام ابو عمرو بن العلا البصری، امام یعقوب حضرمی بصری] نے "اِنَّ" کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا ہے کہ یہ قول کے بعد مقولہ کے مجموعہ سے ہے اور اسی طرح مابعد میں بھی "اِنَّ" مکسور بھی پڑھا گیا ہے۔ بجز اللہ تعالیٰ کے ان فرمان کے۔۔۔ کیونکہ یہ نائب الفاعل کے مجموعہ میں سے ہے۔ امام نافع مدنی، امام ابو بکر عاصم بن بهدله الکوفی نے بھی ان

کی موافقت کی ہے بجز اس فرمان کے ''وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰهِ ''اس بناء پر کہ یہ جملہ مستانفہ ہے یا مقولہ ہے اور باقی تمام قاریوں نے سب کو فتح دیا ہے سوائے ان کے جن کے شروع میں ''ف'' آئی ہے اس بناء پر کہ وہ جنوں کے اقوال میں سے ہے۔ پس ان کو ''بہ'' میں موجود جار مجرور کے محل پر عطف کیا گیا ہے گویا کہ کہا گیا ہے ہم نے قرآن کی تصدیق کی اور اس کی بھی تصدیق کی کہ ہمارا رب کی عظمت اعلیٰ ہے اور یہ ''جَدَّ فُلَان فِيْ عينى '' سے ماخوذ ہے یعنی اس کی حکومت اور بادشاہی عظیم ہے یا اس کا معنی ''غنی'' ہونا ہے اس صورت میں اسے ''جد'' سے مستعار لیا گیا ہے جس کا معنی ہے ''بخت، نصیب'' اور معنی یہ ہے کہ بیوی اور بچوں سے بلند ہونے کی صفت سے اس کو متصف کرنا اس کی عظمت کی وجہ سے ہے یا اس کی بادشاہی کی وجہ سے ہے یا اس کے بیوی وبچوں سے مستغنی ہونے کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ''مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ''اس کا بیان ہے

﴿ مَا اتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا ﴾

(نہ اس نے کسی کو اپنی بیوی بنایا اور نہ بیٹا) اور اسے تمیز ہونے کی وجہ سے ''جداً'' اور ''جِداً'' کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا صدق۔ گویا کہ انہوں نے قرآن میں سے ایسی چیز کو سنا جس نے انہیں ان کی اس خطاء پر آگاہ کر دیا جس کا شرک وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بیوی اور بیٹے بنانے کا اعتقاد رکھا کرتے تھے

﴿ وَّاَنَّهٗ كَانَ يَقُوْلُ سَفِيْهُنَا ﴾

(اور (یہ راز بھی کھل گیا کہ) ہمارے احمق کہتے رہے) یعنی ابلیس یا مردود جن

﴿عَلَى اللّٰهِ شَطَطًا﴾

(اللہ کے بارے میں ناروا باتیں) یعنی ایسی بات جو حق سے بہت دور تھی اور ''شَطَطًا '' کا معنی دور ہونا اور حد سے تجاوز کرنا ہے یا اس قول میں بعید از حق بات کے افراط کی وجہ سے یہ قول انتہائی ناروا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بیوی اور بیٹے کی نسبت کرنا ہے

سوال: جواب:

(سوال)

مصدر تو صفت واقع نہیں ہوتا تو پھر یہاں مصدر صفت کیسے بن گیا؟

سوال: جواب: (جواب)

اس کے بارے میں مندرجہ ذیل احتمال ہیں

مفعول مطلق کی بالواسطہ صفت ہے/ مفعول مطلق کی بلا واسطہ صفت ہے

بالواسطہ صفت واقع ہونے کی صورت میں اس سے پہلے ''ذا'' کا لفظ محذوف ہوگا اور تقدیر کلام یوں ہوگا ''قولا ذا شطط''

یا یہ قولا کی بلا واسطہ صفت ہے اس صورت میں یہ خلاف قاعدہ مبالغہ کے لیے صفت بنائی گئی ہے کیونکہ جو دور از حقیقت بات کی گئی ہے اس میں افراط و زیادتی سے کام لیا گیا ہے اور وہ بات اللہ کی طرف بیوی بیٹے کی نسبت کرنا ہے

﴿ وَّاَنَّا ظَنَنَّآ اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴾

(اور ہم تو خیال کیے تھے کہ انسان اور جن اللہ کئے بارے میں کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے) اس بات میں بیوقوف کی اتباع کرنے پر عذر پیش کرنا ہے کہ انہوں نے اس احمق کی اتباع اپنے اس گمان کی وجہ سے کی تھی کہ کوئی ایک بھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ اور ''كَذِبًا '' کو مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے نصب دی گی ہے

سوال: جواب: (سوال)

مفعول مطلق تو ما قبل فعل کا مصدر ہوتا ہے جب کہ ''كَذِبًا''۔ ''یقول'' فعل کا مصدر تو نہیں ہے پھر اسے مفعول مطلق بنانا کیسے درست ہے؟

(جواب)

سوال: جواب: کیونکہ ''کَذِب'' قول کی ایک نوع ہے (یعنی قول یا سچا ہوتا ہے یا جھوٹا پس اسی وجہ سے اسے مفعول مطلق بنایا گیا ہے)

یا یہ محذوف کی صفت ہے یعنی ''قولا مکذوبا فیه''

(''قولا مکذوبا فیه'' سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''کَذِبًا'' اسم مفعول کے معنی میں صفت ہے اور اس سے پہلے اس کا موصوف ''قولا'' محذوف ہے)

اور جس (قاری) نے امام یعقوب حضرمی بصری کی طرح ''لَّنْ تَقُوْلَ'' کو ''لَّنْ تَقَوَّل'' پڑھا ہے اس نے ''قولا'' کو مفعول مطلق بنایا ہے کیونکہ ''تَقَوّل'' ہوتی ہے جھوٹی بات ہے

﴿وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ﴾

(اور یہ کہ انسانوں میں سے چند مرد پناہ لینے لگے جنات میں سے چند مردوں کی) کیونکہ کوئی آدمی جب کسی ویران جگہ پر رات بسر کرتا تو کہتا میں اس وادی کے سردار کی پناہ مانگتا ہوں اُس کی قوم کے احمقوں کے شر سے

﴿فَزَادُوْهُمْ﴾

(پس انہوں نے بڑھا دیا جنوں کے) پس انسانوں نے جنوں سے پناہ مانگ کر ان کے غرور کو بڑھا دیا

(اس میں اس چیز کی جانب اشارہ ہے کہ ضمیر کا مرجع ''جن'' ہیں)

﴿رَهَقًا﴾

(غرور کو) ''رَهَقًا'' کا معنی، تکبر یا سرکشی ہے یا جنوں نے انسانوں کی گمراہی میں اسقدر اضافہ کر دیا کہ وہ جنوں سے مدد پناہ طلب کرنے لگے

اور ''رہق'' اصل میں کسی چیز کے ڈھانپ لینے کو کہتے ہیں

﴿وَّاَنَّهُمْ﴾

(اور انسانوں نے بھی) بے شک انسانوں نے

﴿ظَنُّوْا كَمَا ظَنَنْتُمْ﴾

(یہ گمان کیا جیسے تم گمان کرتے ہو) اے جنو! یا اس کے برعکس جنوں نے بھی یہی گمان کیا جیسے تم گمان کرتے ہو، اے انسانو! اور یہ دونوں آیتیں جنوں کے اس کلام میں سے ہیں جو ان میں بعض نے بعض سے کیا یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور کلام اللہ ہے اور جس نے ان دونوں آیتوں میں ''اِن'' کو فتحہ دیا ہے اس نے ان دونوں آیتوں کو نائب الفاعل کے مجموعہ میں سے بنایا ہے

﴿اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا﴾

(کہ اللہ کسی کو رسول بنا کر مبعوث نہیں کرے گا) یہ جملہ ''ظَنُّوْا'' کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے

(سادمُسَدّ مَفْعُوْلَى الظَنّ)

﴿وَّاَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ﴾

(اور (سنو!) ہم نے ٹٹولنا چاہا آسمان کو) ہم نے آسمان کی بلندی تک پہنچنا چاہا/ ہم نے آسمان کی خبر کو طلب کیا (خبرھا سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''السماء'' سے پہلے اس کا مفعول محذوف ہے) اور ''اللمس'' کو ''مس'' سے طلب کے لیے مستعار لیا گیا ہے

جیسے۔۔۔کہا گیا ہے ''لَمَسَه، اِلتَمَسَه، تَلَمَّسَه'' جیسے ''طَلَبَه، اَطْلَبَه، تَطَلَّبَ''

ہ﴿فَوَجَدْنٰهَا مُلِئَتْ حَرَسًا﴾

(تو ہم نے اس کو پایا پہروں بھرا ہوا پایا) حَرَساً کا معنی حرّ اس ہے اور یہ اسم جمع ہے جیسے الخدم

﴿شَدِیْدًا﴾

(سخت) قوی اور ان سے مراد وہ ملائکہ ہیں جو انہیں آسمان سے پر جانے سے روکتے تھے

﴿وَّشُهُبًا﴾

(اور شہابوں سے) یہ شہاب کی جمع ہے اور شہاب ایسے روشن انگارہ کو کہتے ہیں جو آگ سے پیدا ہوتا ہے

﴿وَّاَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ مِنْهَا مَقَاعِدَ لِلسَّمْعِ﴾

(اور پہلے تو ہم بیٹھ جایا کرتے تھے اس کے بعض مقامات پر سننے کے لیے) یعنی ایسے مقامات پر جو پہرے داروں اور شہابوں سے خالی ہوتے یا تاڑنے اور چوری چھپے سننے کے لیے صحیح ہوتے

''لِلسَّمْعِ''''نَقْعُد'' کا صلہ ہے یا ''مَقَاعِدَ'' کی صفت ہے (صلہ سے مراد یہ ہے کہ ''لِلسَّمْع''، ''نَقْعُد'' کے متعلق ہے)

﴿فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْلَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾

(لیکن اب جو (جن) سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لیے کسی شہاب کو انتظار میں) یعنی ایسے شہاب کو جو تاڑنے والا ہے اور اسی کی خاطر انتظار میں ہوگا اور رجم کرنے کے ساتھ اس کو چوری چھپے سننے سے روکے گا یا شہابوں والا پائے گا جو اس کو تاڑنے والے ہو گئے اس صورت میں یہ راصد کی اسم جمع ہے اور سورہ صافات میں اس کا بیان گزر چکا ہے

﴿فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ يَجِدْلَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا﴾

(لیکن اب جو (جن) سننے کی کوشش کرے گا تو وہ پائے گا اپنے لیے کسی شہاب کو انتظار میں) آسمان کی حفاظت کے ساتھ

﴿اَمْ اَرَادَبِهِمْ رَبُّهُمْ رَشَدًا﴾

(یا ان کے رب نے ان کو ہدایت دینے کا ارادہ فرمایا ہے) (''رَشَدًا'' معنی بتا رہے ہیں) یعنی خیر کا

﴿وَّاَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ﴾

(اور ہم میں بعض نیک بھی ہیں) نیک اور جنتی

﴿وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾

(ااور بعض اَور طرح کے) اور ایسی قوم بھی ہے جو دوسروں کی طرح ہے موصوف ہو حذف کر دیا گیا ہے اور وہ کوتاہی کرنے والے ہیں (''قوم'' موصوف ہے اور ''دون ذٰلک'' صفت ہے)

﴿كُنَّا طَرَآئِقَ﴾

(ہم بھی تو راستوں پر گامزن ہیں) ہم راستوں والے تھے یعنی مختلف مذہبوں والے تھے۔۔۔۔یا ہم احوال کے مختلف ہونے میں راستوں کی مثل تھے یا ہمارے راستے جدا جدا تھے

﴿قِدَدًا﴾

(کئی) جدا جدا ''قِدَدًا''، ''قدة'' کی جمع ہے اور ''قد'' سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب کوئی کسی چیز کاٹ دے

﴿وَّاَنَّا ظَنَنَّا﴾

(اور (اب) ہمیں یقین ہو گیا ہے) بے شک ہمیں یقین ہو گیا

﴿اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ﴾

(کہ زمین میں بھی اللہ تعالی کو ہرگز عاجز نہیں کر سکتے) خواہ ہم جہاں کہیں بھی زمین ہو

(''کائنین فی الارض '' کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''فی الارض'' حال واقع ہو رہا ہے)

﴿وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ هَرَبًا﴾

(اور نہ ہی بھاگ کر اسے ہرا سکتے ہیں) زمین سے آسمان کی طرف بھاگتے ہوئے یا یہ ہوگا کہ ہم زمیں میں رہتے ہوئے اللہ تعالی کو عاجز نہیں کر سکتے اگر وہ ہمارے ساتھ کسی معاملہ کا ارادہ فرمائے اور اگر وہ ہمیں طلب کرے تو ہم ہرگز نہیں بھاگ سکیں گے

﴿وَّاَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا الْهُدٰٓى﴾

(اور (اے جن بھائیو!) ہم نے جب پیغام ہدایت سنا) قرآن کو

﴿اٰمَنَّا بِهٖ ۔فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ﴾

(تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ پس جو شخص اپنے رب پر ایمان لاتا ہے تو نہیں خوف ہوتا اس کو) پس وہ نہیں ڈرتا فھو لا یخاف کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ متن میں ''ف'' کے بعد ''ھو'' مبتدا مقدر ہے اور جملہ فعلیہ جزاء واقع نہیں ہو رہا بلکہ جملہ اسمیہ جزاء بن رہا ہے) اور لا یخاف کو لا یخف بھی پڑھا گیا ہے

(اس سورت میں اس جانب اشارہ ہے کہ فعل طلبی ہے اور اس پر جزم آئی ہے) اور پہلی صورت ''فھو لا یخاف '' مومنین کی نجات کے متحقق ہونے اور مومنین کے ساتھ اس کے اختصاص پر زیادہ دلالت کرنے والی ہے

(کیونکہ اس صورت میں معنی ہوگا کہ مومن تو جزاء وسزا کے معاملات میں کسی کمی وغیرہ سے نہیں ڈرتا البتہ کا فر ضرور ڈرتا ہے)

سوال: جواب: (سوال)

جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ جب فعل مضارع جزاء واقع ہو تو اس کے آخر پر جزم لازمی آتی ہے جبکہ ''فھو لا یخاف '' پر جزم داخل نہیں ہوئی اور اس کا آکر بھی مرفوع نہیں ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

امام بیضاوی فھو لا یخاف'' کی عبارت سے اس جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ متن میں ''ف'' کے بعد ''ھو'' مبتدا مقدر ہے اور جملہ فعلیہ جزاء واقع نہیں ہو رہا بلکہ جملہ اسمیہ جزاء بن رہا ہے

﴿بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا﴾

(تو کسی نقصان کا اور نہ ظلم کا) جزاء میں نقصان کا اور نہ اس چیز کا کہ قیامت کے دن اس پر ذلت چھا رہی ہوگی۔ یا کمی کرنے اور ظلم کرنے کی جزاء کا کیونکہ اس نے نہ کسی کے حق میں کمی کی اور نہ کسی پر ظلم ڈھایا، کیونکہ قرآن پر ایمان لانے کے حق میں سے ہے کہ آپ اس صفت مذموم سے اجتناب کریں

﴿وَّاَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ وَ مِنَّا الْقٰسِطُوْنَ۔﴾

(اور بے شک ہم میں سے کچھ تو فرمانبردار ہیں اور کچھ ظالم) راہ حق سے دور ہٹنے والے اور ''راہ حق'' ایمان لانا اور اطاعت الہی ہے

﴿ فَمَنْ اَسْلَمَ فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا رَشَدًا﴾

(تو جنہوں نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے راہ حق تلاش کر لی) انہوں نے عظیم ہدایت کا قصد کیا جو انہیں دار ثواب تک لے جائے گی

﴿وَاَمَّا الْقٰسِطُوْنَ فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا﴾

(اور جو حق سے منحرف ہوتے ہیں تو وہ جہنم کا ایندھن ہیں) جہنم کو ان کے ساتھ جلایا جائے گا جس طرح انسانوں کے کافروں کے ساتھ اسے جلایا جائے گا

﴿وَّاَنْ لَّوِ اسْتَقَامُوْا﴾

(اور اگر وہ ثابت قدم رہیں) اگر جن یا انسان یا دونوں ثابت قدم رہیں (ان الشان'' کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ ''ان'' مخفف من مثقلہ ہے اور اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے ''اسْتَقَامُوْا'' میں ضمیر کے مرجع کے بارے میں تین احتمالات ہیں 1: جن 2: انسان 3: جن وانسان)

﴿عَلَى الطَّرِيْقَةِ﴾

(راہ حق پر) طریقہ اسلام پر (المُثلی: یہ اسم تفضیل کی مؤنث ہے)

﴿لَاَسْقَيْنٰهُمْ مَّآءً غَدَقًا﴾

(تو ہم انہیں سیراب کریں گئے کثیر پانی سے) تو ہم ان پر رزق کی فروانی کر دیں گے (یہاں مجاز مرسل ہے سبب بول کر مسبب مراد ہے علاقہ سببیت کا ہے)

سوال: جواب: (سوال)

اگر ''ماء غدق'' کا معنی رزق ہے تو پانی کو خصوصا ذکر کیوں فرمایا؟

سوال: جواب: (جواب)

''ماء غدق'' ﷺ اس سے مراد کثیر پانی ہے ﷺ کے ذکر کو خاص کرنا اس لیے ہے کہ عرب میں کثیر پانی نادر الوجود ہے'')

﴿لِّنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ﴾

(تا کہ ہم ان کی آزمائش کریں اس فراوانی سے) تا کہ ہم اس فروانی کے ساتھ ان کی آزمائش کرئیں کہ کیسے وہ اس کا شکر ادا کرتے ہیں اور کہا گیا ہے کہ اس کا معنیٰ یہ ہے کہ اگر جن اپنے قدیم طریقہ پر قائم رہے تو اور قرآن کو سننے کے باوجود بھی اسلام قبول نہ کرتے تو ہم ان پر استدراج کرتے ہوئے رزق کی فروانی فرما دیتے تا کہ ہم انہیں فتنہ میں گرائیں اور کفران نعمت میں ان کو عذاب دیں

﴿وَمَنْ يُّعْرِضْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ﴾

(اور جو منہ موڑے گا اپنے رب کے ذکر سے) اپنے رب کی عبادت سے یا اس کی نصیحت سے یا اس کی وحی سے

﴿يَسْلُكْهُ﴾

(تو وہ اسے داخل کرئے گا) تو وہ اسے داخل کرئے گا (يَسْلُكْهُ کا مطلب بتا رہیں ہیں)

﴿عَذَابًا صَعَدًا﴾

(سخت عذاب میں) ایسا سخت عذاب جو معذَّب پر بلند ہوگا اور غالب آجائے گا ''صَعَدًا'' مصدر ہے اور اس کے ساتھ عذاب کی صفت بیان کی گئی ہے

﴿وَّاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ﴾

(اور بے شک سب مسجدیں اللہ کے لیے ہیں) اللہ کے لیے مختص/ خاص ہیں

﴿فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا﴾

(پس مت عبادت کرو اللہ کے ساتھ کسی کی) پس ان میں اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور جس نے 'اَن'' کو لا کے مقدر ہونے کی ساتھ نہی کی علت بنایا ہے اس نے ''ف'' کے فائدہ کو لغو کر دیا ہے

وضاحت

(آج ہمارے معاشرے میں بہت سے نام نہاد علماء نے جعلی جبہ وقبہ لگا کر اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے نظر آتے ہیں کہ ''تم مسجدوں میں اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو'' اور اس سے استدلال کرتے ہیں اور ڈینگے مارتے پھرتے ہیں کہ مساجد میں محفل نعت ومیلا دالنبی ودیگر اسلامی محافل کا انعقاد کا جائز نہیں ان کی بارگاہ میں یہ ناچیز ملتجی ہے کہ امام بیضاوی جو کہ شافعی مسلک ہیں وہ بھی ''فلا تعبدو افیھا غیرہ'' کہ عبارت سے اس جانب اشارہ کر رہے ہیں کہ یہاں ''دعا یدعو'' جس

کے لغت عرب میں متعدد معنیٰ ہیں یہاں پکارنے کے معنی میں نہیں بلکہ عبادت کے معنیٰ میں مستعمل ہے۔اللہ تعالی ہمیں صراط مستقیم پر چلنے و چلانے کی توفیق ھبہ فرمائے (آمین))

اور کہا گیا ہے کہ مساجد سے مراد تمام روئے زمین کی مساجد مراد ہیں کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسے (پوری زمین کو) مسجد بنادیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد مسجد حرام ہے

سوال: جواب: (سوال)

مسجد حرام تو ایک ہی ہے اور مساجد جمع کا صیغہ ہے تو اس سے ایک مسجد حرام مراد لینا کیسے درست ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کیونکہ یہ تمام مساجد کا قبلہ ہے

اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد "مواضع السجود" ہیں اس صورت میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے روکنا مراد ہے۔اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد سات اعضاء ہیں جن پر سجدہ کے لیے ٹیک لگائی جاتی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس سے مراد پیشانیاں ہیں اس صورت میں "مَساجِد" "مسجَد" (مصدر میمی) کی جمع ہوگی

﴿ وَّاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُاللّٰهِ ﴾

(اور جب کھڑا ہوتا ہے اللہ کا خاص بندہ) یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

سوال: جواب: (سوال)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات میں سے صفتِ عبد کو خاص کرنے میں کیا حکمت عملی ہے جبکہ آقا دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو لامتناہی صفات سے متصف ہیں؟

سوال: جواب: (جواب)

اور عبد کے لفظ کو تواضع کے لیے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ یہ جملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اپنے طرف سے کلام کرنے کے محل میں واقع ہورہا ہے (جواب دوم) یا اس وجہ سے کہ صفت عبودیت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کا تقاضا کرتی ہے

﴿ يَدْعُوْهُ ﴾

(تا کہ اس کی عبادت کرئے) تا کہ اس کی عبادت کرئے

﴿ كَادُوْا ﴾

(تو لوگ) قریب ہے کہ جن (واو جمع کی ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں)

﴿ يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا ﴾

(اس پر ہجوم کر کے آجاتے ہیں) جو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادت میں سے دیکھا تھا اور جو قرأت سے رضی اللہ عنہم حصہ سنا تھا اس پر تعجب کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھیڑ کر کے آجائیں یا قریب ہے کہ جن و انسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جمع ہو کر آجائے رضی اللہ عنہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو ختم کردیں رضی اللہ عنہا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملہ کو باطل کردیں اور "لِبَدًا" "لِبَدَة" کی جمع ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس کا بعض حصہ بعض پر جمع ہوجائے جیسے شیر کی گردن کے بالوں کو بھی "لِبدة" کہا جاتا ہے کیونکہ وہ بھی تہہ در تہہ ہوتے ہیں۔اور امام ابن عامر شامی سے "لُبَدا" لام کے ضمہ کے ساتھ مروی ہے اس صورت میں یہ "لُبْدَة" کی جمع ہوگی اور یہ بھی ایک لغت ہے اور اسے لُبَّدا بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ سُجَّدا ہے اس صورت میں یہ لابد کی جمع ہوگی اور دو ضموں کے ساتھ لُبُد ابھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ صُبُرا ہے اس صورت میں یہ لَبُود کی جمع ہوگی

﴿ قُلْ اِنَّمَآ اَدْعُوْا رَبِّیْ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴾

(آپ فرمائیے میں تو بس اپنے رب کی عبادت کرتا ہوں اور شریک نہیں ٹھراتا اس کا کسی کو) نہ تو کوئی نئی چیز ہے اور مہ ہی ایسا ناپسندیدہ امر ہے جو کہ تمہارے تعجب کو ثابت کرے یا میری دشمنی پر تمہیں متفق/ اکھٹا کرے اور امام عاصم ۔امام حمزہ بن الذیات الکوفی نے حضور ﷺ کو امر کی بنا ء پر قل پڑھا ہے تا کہ مابعد کے موافق ہو جائے

﴿قُلْ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا﴾

(آپ فرمائیے (اللہ کے اذن کے بغیر) نہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ ہدایت کا) رشدا کا معنی نفعا ہے، ضرا کا معنی نفعا ہے یعنی گمراہ کرنے کا اور نہ ہدایت کا۔ایک کو اس کے نام کے ساتھ اور دوسرے کو اس کے سبب یا مسبب کے نام کے ساتھ، دونوں معانی کا شعور دلانے کے لیے تعبیر کیا گیا ہے

﴿قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ﴾

(آپ فرمائیے مجھے اللہ سے کوئی پناہ نہیں دے سکتا) اگر وہ میرے ساتھ برا کرنے کا ارادہ فرمائے

﴿وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا﴾

(اور نہ میں پا سکتا ہو اس کے بغیر کہیں پناہ) پلٹنے کی جگہ/ پناہ گاہ

﴿اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ﴾

(البتہ میرا فرض صرف یہ ہے کہ میں پہنچا دو اللہ کے احکام) یہ "لَاۤ اَمْلِكُ" کے فرمان سے استثناء ہے کیونکہ تبلیغ، راہنمائی کرنا اور نفع پہنچانا ہے (اس صورت میں استثناء متصل ہوگا) استثناء اور استثناہ کے درمیان جملہ معترضہ ہے جو کہ استطاعت کی نفی کی تاکید بیان کر رہا ہے یا یہ "مُلْتَحَدًا" سے استثناء ہے معنی ہو گا کہ اگر میں اللہ تعالی کے احکام نہ پہنچاؤں تو میں اس کے بغیر کہیں پناہ نہیں میں پا سکتا (اس سورت میں استثناء منقطع ہے) اور ماقبل جملہ کی دلیل ہے (یعنی اِلَّا بَلٰغًا مِّنَ اللّٰهِ شرط ہے اور جواب شرط محذوف ہے اور ماقبل کلام اس پر دلالت کر رہا ہے (ضیاء القرآن کا ترجمہ استثناء منقطع کی صورت میں ہے)

﴿وَرِسٰلٰتِهٖ﴾

(اور اس کے پیغامات) اور اس کے پیغامات۔اس کا عطف "بَلٰغًا" پر ہے اور "مِّنَ اللّٰهِ" اس کی صفت ہے کیونکہ "بلغ" کا صلہ "عن" استعمال ہوتا ہے جس طرح حدیث مبارکہ ہے "بلغو عنی ولو ایہ"

﴿وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ﴾

(پس (اب) جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی) توحید کے معاملہ میں

(سوال) سوال: جواب:

امر بالتوحید میں نافرمانی کا مفہوم کیسے اخذ کیا گیا ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

کیونکہ کلام اس کے متعلق ہے

﴿فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ﴾

(تو اس کے لیے جہنم کی آگ ہے) اور اسے "فَاَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ" بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں تقدیر کلام یوں ہوگا "جَزَاؤُهٗ اَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ" (یعنی "اَنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ" "جَزَاؤُهٗ" مبتدا محذوف کی خبر ہے)

﴿خٰلِدِیْنَ فِیْهَاۤ اَبَدًا﴾

(جس میں یہ (نافرمان) ہمیشہ رہیں گئے تا ابد) جس میں یہ یہ نافرمان مہیشہ رہیں گے)

سوال: جواب: (سوال)

یہ جملہ ''مَن'' سے حال واقع ہورہا ہے اور ''مَن'' کی جانب واحد کی ضمیر راجح ہے جبکہ ''خٰلِدِيْنَ'' جمع کا صیغہ ہے ان میں موافقت کیسے ممکن ہے؟

سوال: جواب: (جواب)

اور خالدین کو جمع ذکر کرنا معنی کی وجہ سے ہے (یعنی یہ جملہ ''مَن'' سے حال واقع ہورہا ہے اور ''مَن'' میں جمع کا مفہوم پایا جاتا ہے اس رعایت معنوی کی وجہ سے خالدین کو جمع ذکر کیا)

﴿حَتّٰى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ﴾

(یہاں تک کہ جب وہ دیکھ لیں گے (وہ عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا ہے گیا) دنیا میں جس طرح واقعہ بدر یا دیکھ لیں گے (وہ عذاب) جس کا ان سے وعدہ کیا ہے گیا آخرت میں اور غایت کا حتیٰ کا تعلق دوسرے معنی پر محمول کرتے ہوئے يَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِ لِبَدًا سے ہے (دوسرا معنی: اجتمعوا ابطال عمرہ) یا یہ محذوف کے متعلق ہے اور اس محذوف کلام پر کفار کا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کمزور کرنے اور نافرمانی کی حالت دلالت کررہی ہے

﴿فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ اَضْعَفُ نَاصِرًا وَّاَقَلُّ عَدَدًا﴾

(تو انہیں پتہ چل جائے گا کہ کون ہے جس کا مددگار کمزور ہے اور جس کی تعداد کم ہے) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یا وہ کفار

﴿قُلْ اِنْ اَدْرِیْ﴾

(آپ فرمائے میں (اپنی سوچ بچار سے) نہیں جانتا) میں نہیں جانتا (''ما ادری'' سے اس جانب اشارہ فرمارہیں کہ ''ان'' نافیہ ہے)

﴿اَقَرِيْبٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ اَمْ يَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْۤ اَمَدًا﴾

(کہ وہ دن قریب ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے یا مقرر کردی گئی ہے اس کے لیے میرے رب نے لمبی مدت) ایسی غایت جس کی مدت طویل ہے ۔گویا کہ جب کفار نے آیت حَتّٰى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ کو سنا تو ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا متی یکون کہ وہ قیامت کب برپا ہورہی ہے؟ تو ان سے کہا گیا کہ قیامت لامحالاہ واقع ہوگی لیکن میں اپنی سوچ و بچار سے اس وقت نہیں جانتا

﴿عٰلِمُ الْغَيْبِ﴾

((اللہ تعالیٰ) غیب کو جاننے والا ہے) وہ عالم الغیب ہے (''ھو'' سے اس جانب اشارہ فرمارہے ہیں کہ ''عٰلِمُ الْغَيْبِ'' مبتدا محذوف کی خبر ہے)

﴿فَلَا يُظْهِرُ﴾

(پس وہ آگاہ نہیں کرتا) وہ مطلع نہیں کرتا یعنی اس غیب پر جو اس کے ساتھ خاص ہے

﴿عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا﴾

(اپنے غیب پر کسی کو.) وہ مطلع نہیں کرتا یعنی اس غیب پر جو اس کے ساتھ خاص ہے

﴿اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى﴾

(بجز اس کے جس کو اس نے پسند فرمالیا ہو (غیب کی تعلیم کے لیے)) اپنے بعض علم کے عطاء کرنے کے لیے یہاں تک کہ وہ اس کا معجزہ بن جائے

﴿مِنْ رَّسُوْلٍ﴾

(اس کے رسول) یہ من کا بیان ہے اور اس آیت کریمہ سے ابطال کرامت اولیاء پر استدلال کیا جاتا ہے اور اسکا جواب یہ ہے کہ رسولوں کی تخصیص فرشتوں کے ساتھ ہے اور ان کو بغیر واسطہ کے مطلع فرمایا جاتا ہے اور مغیبات پر اولیا کی کرامت ملائکہ کے سکھانے کے سبب ہے۔ جس طرح ہمارا احوال آخرت پر مطلع ہونا انبیاء کے توسط سے ہے

﴿فَاِنَّهٗ يَسْلُكُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ﴾

(تو وہ مقرر کر دیتا ہے اس رسول کے آگے)اُس رسول مرتضٰی کے آگے

﴿ وَمِنْ خَلْفِهٖ رَصَدًا﴾

(اور اس کے پیچھے محافظ)ملائکہ میں سے ایسا محافظ جو شیاطین کے اچک لینے اور ان کے خلط ملط کرنے سے اس نبی مرتضٰی کی حفاظت فرمائیں

﴿لِّيَعْلَمَ اَنْ قَدْ اَبْلَغُوْا ﴾

(تا کہ وہ دیکھ لے کہ انہوں نے کہ پہنچا دیے ہیں)تا کہ وہ نبی جن کی طرف وحی کی گئی ہے وہ جان لیں کہ جبرئیل علیہ السلام اور وہ ملائکہ جو وحی لیکر نازل ہوتے ہیں" نے پیغام پہنچا دیا ہے یا معنی یہ ہے کہ تا کہ اللہ تعالی جان لیں کہ رسولوں نے پیغام پہنچا دیے ہیں

سوال: جواب:(سوال)

اللہ تعالیٰ تو ازل سے ہے وہ ہر چیز کو اس کی تخلیق سے بھی پہلے جانتا ہے تو "یعلم" فعل کی نسبت اللہ تعالی کی طرف کرنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

سوال: جواب:(جواب)

تا کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس بات کے ساتھ اس کے وجود کے وقت متعلق ہو جائے

﴿رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ ﴾

(اپنے رب کے پیغامات)جیسے وہ تغیر و تبدل سے محفوظ تھے بالکل ویسے ہی حفاظت کے ساتھ پہنچا دیے ہیں

﴿وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ﴾

((درحقیقت پہلے ہی)اللہ ان کے حالات کا احاطہ کیے ہوئے ہے)جو کچھ رسولوں کے پاس ہے(عند الرسول کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ "لدیھم" کی ضمیر کا مرجع رسول ہیں)

﴿ وَاَحْصٰى كُلَّ شَيْءٍ عَدَدًا﴾

(اور ہر چیز کا اس نے شمار کر رکھا ہے ہر چیز کو از روئے تعداد کے)یہاں تک کہ بارش / پانی کے قطروں کو اور ریت کے ذروں کو

سورۃ نمبر	سورہ المزمل	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ﴾

(اے چادر لپیٹنے والے!)مزمل کی اصل متزمل ہے جو کہ تزمل بثیابہ سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص اپنے اوپر کپڑا لپیٹ لے

سوال: متزمل سے مزمل کیسے بنا؟

جواب: متزمل میں (ت) کو (ز) میں ادغام کر دیا اور مزمل کو اصل پر رکھتے ہوئے متزمل بھی پڑھا گیا ہے اور اسے المزمل میم کے فتحہ اور میم کے کسرہ کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے یعنی وہ شخص جس کو کسی دوسرے نے چادر اوڑھائی یا وہ شخص جس نے چادر اوڑھی۔

سوال: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مزمل کے نام کے ساتھ پکارنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب اول

"تهجينا لما كان عليه لانه كان نائما "

جس حالت پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تھے اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے اس نام کے ساتھ پکارا گیا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سو رہے تھے (امام بیضاوی رحمہ اللہ تعالیٰ علیہ نے یہ عبارت علامہ زمخشری کی اتباع کرتے ہوئے ذکر کی ہے اور یہ مناسب نہیں کیونکہ اس میں سوء ادب ہے)

جواب دوم:

او مرتعدا مماد تهنه جدء الوحی شر ملا

یا پھر وحی کی ابتداء کی دہشت کی وجہ سے آپ ﷺ پر کپکپی طاری تھی درآنحالیکہ آپ ﷺ اپنے اوپر چادر کے ٹکڑے کو اوڑھے ہوئے تھے۔

جواب سوم

" تحینا له اذا روی انه علیه الصلاة والسلام کان یصلی متلففا بمقیة مرط مفروش علی عائشة فنزلت "یا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ ﷺ کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس پر تحسین کرتے ہوئے اس نام کے ساتھ خطاب فرمایا کیونکہ روایت کیا گیا ہے کہ حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اوپر بچھی ہوئی چادر کے بقیہ حصہ کو اپنے اوپر لپیٹ کر نماز ادا فرما رہے تھے تو (اس وقت) یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

(نوٹ) یہ قول درست نہیں ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور ﷺ کے حرم میں ہجرت کے بعد داخل ہوئی اور جبکہ یہ صورت مکی ہے۔

امام فخر الدین رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں فرمایا ہے کہ آپ ﷺ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی چادر میں لپٹے ہوئے تھے (واللہ اعلم والصواب)۔

جواب چہارم:

"تشبیهنا له فی تثاقله بالمتزمل لانه لم یتمرن بعد فی قیام الیل "

یا اس وجہ سے آپ ﷺ کو اس نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے تحمل کا بوجھ برداشت کرنے میں آپ ﷺ کو متزمل (چادر اوڑھنے والے شخص کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ اس سے پہلے حضور ﷺ کو ابھی تک رات کے قیام میں مشق نہیں ہوئی تھی

تشبیهنا کی عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ اس میں استعارہ ہے (یہ قول بھی ضعیف اور نامناسب ہے کیونکہ اس میں بھی بے ادبی کا شائبہ ہے)

یا پھر یہ **تزمل بثیابه** سے ماخوذ نہیں بلکہ تزمل الزمل سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص بوجھ اٹھائے (اس صورت میں معنی یہ ہوگا) اے وہ ذات جس نے نبوت کے باراں گراں کو برداشت فرمایا۔

﴿ قُمِ الَّيْلَ ﴾

(رات کو (نماز کے لیے) قیام فرمایا کیجئے) یعنی نماز کے لئے یا رات کو نماز پر دوام اختیار فرمائے اور اتباع کے لئے "م" کے ضمہ کے ساتھ "تخفیف کے لئے "م" کے فتح کے ساتھ پڑھا گیا ہے۔

یعنی جب میم کے اوپر ضمہ پڑھیں گے تو اس وقت ق کی اتباع ہوگی قم اور جب میم کے فتح کے ساتھ پڑھے گے تو اس وقت تخفیف کے لئے ہوگا۔

﴿اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِانْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْعَلَيْهِ ﴾

(مگر تھوڑا یعنی نصف رات یا کم کرلیا کریں اس سے بھی تھوڑا سا یا بڑھا دیا کریں اس پر)

یہ کلام الیل سے استثناء ہے اور **نصفه قلیلا** سے بدل ہے۔

﴿وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾

(اور(حسبِ معمول) خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا کیجئے قرآن کریم کو)

یعنی قرآن کریم کو آہستگی کے ساتھ اور حروف کو واضح کرتے پڑھیے اس طرح کہ سننے والے کے لئے حروف کو شمار کرنا ممکن ہو جائے یہ عربوں کے قول ثغو رتل ورتل سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب دانتوں کے مابین فاصلہ ہو(یعنی کھلے کھلے دانت)

﴿ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ﴾

(بے شک ہم جلد القاء کریں گئے آپ پر ایک بھاری کلام)"قولا ثقیلا"

ثقیلا کے بارے میں دو احتمال ہیں

بھاری کلام سے مراد قرآن ہے۔

سوال: قرآن جیسی عظیم الشان کتاب کو قولا ثقیلا بھاری کلام کہنے میں حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: قرآن کریم میں مشکل تکالیف (احکام) ہیں جو مکلفین پر ثقیل (بھاری وزنی) ہیں بالخصوص آقا دو عالم ﷺ پر۔

سوال: امت کے غم خوار پر یہ کلام بالخصوص ثقیل کیوں ہے؟

جواب: کیونکہ حضور ﷺ کے لئے ضروری ہے کہ آپ ﷺ خود بھی اس کو برداشت فرمائیں اور امت پر بھی اس کو نافذ فرمائیں۔

اور کلام (ورتل القرآن ترتیلا)(انا سنلقی علیك قولا ثقیلا) جملہ معترضہ ہے جو آپ ﷺ پر تہجد کی تکالیف کو آسان کرتا ہے۔

گویا کہ ارشاد فرمایا گیا کہ آپ ﷺ پر نازل ہونے والی وحی میں ایسے مشکل احکام نازل ہونے والے ہیں جن کی نسبت یہ قیام اللیل آسان ہے۔

اور یہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تہجد ایسی مشق ہے جو طبیعت کے متضاد ہے نفس کے مخالف ہے۔

دوسرا احتمال: ثقیلا کا معنی رصین ہے (یعنی پختہ ثابت) الفاظ کی پختگی اور معنی کی عمدگی کی وجہ سے (محکم و مضبوط ہوگا) یا یہ حضور ﷺ پر ثقیل نہیں بلکہ اس شخص پر ثقیل ہے جو قرآن کریم کو غور و فکر کرتا ہے کیونکہ وہ باطن کی مزید پختگی اور نظر کو دیگر اشیاء سے جدا کرنے کا محتاج ہے۔

یا یہ میزان پر ثقیل ہے یا کفار اور فجار پر ثقیل ہے۔

یا نبی کریم ﷺ پر اس کلام کا لینا ثقیل ہے کیونکہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا فرمان ہے کہ میں نے حضور ﷺ کو دیکھا اس حال میں کہ سخت سردی کے ایام میں آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی تھی اور جب وحی اختتام پزیر ہوئی تو آپ ﷺ کی پیشانی پسینہ سے شرابور تھی۔

اسی وجہ سے جائز ہے کہ یہ قول مصدر کی صفت ہو اور جملہ تمام توجیہات کی بناء پر جو تعلیل (یعنی علت بیان کرنے کے لئے ہے) تہجد نفس کو ان امور کے لئے تیار کرتی ہے جن کا برداشت کرنا مشکل ہو۔

جب ثقیلا مفعول مطلق کی صفت ہو نہ کہ قولا کی طرح مفعول بہ تو تقدیر کلام یوں ہوگا"انا سنلقی علیك قولا القاء ثقیلا "

﴿ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ ﴾

(بلاشبہ رات کا قیام)یعنی ہو نفس جو اپنے بستر سے عبادت کے لئے اٹھتا ہے۔

"ان النفس اللتی "

اس عبارت سے اس جانب اشارہ ہے کہ ناشئۃ صفت کا صیغہ ہے اور اس سے پہلے النفس موصوف محذوف ہے۔

اس عبارت میں یہ عربوں کے قول نشاء من مکانہ سے ماخوذ ہوگا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا ہو جیسے شاعر کا قول ہے

نشائنا الی خوص بری نیھا البری

والصق منھا مشرفات العماحد

ہم ایسی اونٹنیوں کی جانب اٹھے جن کی چربی کو رات کے سفر نے کمزور کر دیا۔

دوسرا احتمال: ناشئۃ سے مراد رات کو قیام کرنا ہے اس بناء پر کہ رات کو اٹھنا عبادت کے لئے ہوتا ہے اس صورت میں ناشئہ مصدر ہوگا جیسے کاذبہ مصدر ہے اور اس سے مراد قیام ہے۔

تیسرا احتمال: ناشئہ سے مراد ایسی عبادت ہے جو رات کو کی جاتی ہے (اس صورت میں ناشئہ کی اللیل کی طرف اضافت اختصاصیہ ہوگی یعنی وہ عبادت رات کے ساتھ خاص ہے۔

چوتھا احتمال: ناشئۃ سے مراد رات کی گھڑیاں ہیں کیونکہ رات کی گھڑیاں یکے بعد دیگر پیدا ہوتی ہیں۔

اس صورت میں ناشئہ صفت کا صیغہ ہی ہوگا اور اس کا موصوف ساعات محذوف ہوگا۔

پانچواں احتمال: ناشئہ سے مراد رات کی ابتدائی گھڑیاں ہیں اس صورت میں یہ نشأت سے مشتق ہوگا یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ کسی کام (چیز کی ابتداء کریں)

﴿هِيَ اَشَدُّ وَطْأً﴾

((نفس کو) سختی کے ساتھ روندتا ہے)

وطأ کے بارے میں دو احتمال ہیں

پہلا احتمال: وطأ کا معنی کلفۃ ہے (یعنی اس کا روندنا انتہائی سخت ہے)

دوسرا احتمال: وطأ کا معنی ثبات قدم ہے (یعنی وہ نفس جو رات کو عبادت کے لئے اپنے بستر سے جدا ہوتا ہے وہ زیادہ تکلیف برداشت کرتا ہے اور ثابت قدم رہنا سخت ہوتا ہے۔

ابو عمرو اور ابو عامر شامی نے وطأ کو وطا پڑھا ہے اس صورت میں یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہوگا۔

سوال: باب مفاعلہ میں دونوں اطراف سے موافقت کا کس طرح ہوگی؟

جواب: دل اور زبان کو ایک دوسرے کے ساتھ موافق کرنے میں (سخت ہیں) یا رات کے قیام میں موافقت کرنے میں (سخت) ہیں یا پھر خلوص اور خضوع سے مراد لی گی اشیاء موافقت پیدا کرنے میں (سخت تھے)۔

یعنی رات کو اٹھنے کا مقصد خشوع وخضوع اور اخلاص ہے اور اس میں موافقت کرنے میں رات کا اٹھنا سخت ہے۔

اگر وطأ کو وطأ پڑھا جائے اور ناشئہ سے مراد نفس لیا جائے تو معنی ہوگا کہ دل اور زبان کا ملکر نفس کو روندنا سخت ہے اور اگر ناشئہ سے مراد قیام رات کی گھڑیاں مراد لی جائیں تو معنی یہ ہوگا کہ قیام عبادت یا رات کی گھڑیاں میں دل اور زبان کا باہم ایک دوسرے کو روندنا سخت ہے۔

﴿ وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ﴾

(اور بات کو درست کرتا ہے)

یعنی بات کو سیدھا کرنے والا ہے یا قرأت کو پختہ کرنے والا ہے کیونکہ اس وقت دل اور زبان حاضر ہوتیں ہیں اور آوازوں کا سکون ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ لَكَ فِى النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا﴾

(یقیناً آپ کو دن میں بڑی مصروفیتیں ہیں)

یعنی دن میں مہمات میں ادھر ادھر جانا ہوتا ہے اور ان مہمات میں مشغول ہوتا ہے اس لئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر رات کو اٹھ کر عبادت کرنا لازم ہے کیونکہ حق کے ساتھ مناجات، فراغت کا تقاضا کرتی ہیں اس صورت میں یہ ''سبح الصوف'' سے مستعار لیا گیا ہے اور اس کا معنی روئی دوھنا اور اس کے اجزاء کو بکھیرنا ہے۔

﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ ﴾

(اور ذکر کیا کرو اپنے رب کے نام کا)

سوال: اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی آقا دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا کرتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے یہاں کا صیغہ استعمال فرمایا اس میں کس بات کی جانب اشارہ ہے؟

جواب: اس امر سے دوام کی جانب اشارہ ہے ترجمہ ہے ہوگا اپنے رب کے نام کے ذکر پر رات دن دوام اختیار کیجئے اللہ تعالیٰ کا ذکر ان تمام اشیاء کو تھلیل (لا الہ الا اللہ) تمجید (اس کی بزرگی بیان کرنا) تحمید (الحمد للہ) اور نماز پڑھنا، قرآن کی تلاوت کرنا اور علم (سیکھنا) سکھانا۔

﴿وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا﴾

(اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو)

یعنی عبادت کے ساتھ سب سے جدا ہو کر اسی کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس کے علاوہ تمام اشیاء سے اپنے نفس کو خالی فرمائیں۔

سوال: ترکیب کلام میں تبتیلا مفعول مطلق بن رہا ہے جبکہ قاعدہ کہ مطابق تبتلا ہونا چاہیے تھا نہ کہ تبتیلا تفعل کی جگہ تفعیل کے مصدر کو ذکر کرنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: نکتہ لطیف کی وجہ سے اور فواصل آیات کے آخری الفاظ کی رعایت کی وجہ سے تبتل کی جگہ تبتیل رکھا گیا ہے۔

(وضاحت ملاحظہ فرمائیں)

تبتل سے مراد یہ ہے کہ عبادت کے ساتھ رب کی جانب متوجہ ہو جائیں اور تبتل سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو اس کے سوا تمام اشیاء سے خالی کر دیجئے اور غیر کی طرف توجہ نہ فرمائیں اس نکتہ لطیف کی وجہ سے اور فواصل (آیات کے آخری الفاظ) کی رعایت کی وجہ سے تبتل کی جگہ تبتیل رکھا گیا ہے یعنی باب تفعل اور باب تفعیل دونوں کا مفہوم مراد ہے یہ اس کی معنوی حکمت ہے اور فواصل کی رعایت کرنا یہ اس کی لفظی حکمت ہے۔

﴿رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ﴾

(مالک ہے شرق و غرب کا)

امام بیضاوی ترکیب کلام کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں یہ ھو مبتدا محذوف کی خبر ہے یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر (﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ (اسکے سوا کوئی معبود نہیں)) ہے اور ابن عامر اور امام حفص کے علاوہ کوفیوں نے اور یعقوب نے من ربک سے بدل بناتے ہوئے جر کے ساتھ پڑھا ہے اور کہا گیا ہے کہ حرف قسم کے مضمر ہونے کے ساتھ (مجرور پڑھا گیا ہے) اور جواب قسم لا الہ الا اللہ ہے۔

﴿فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾

(پس بنائے رکھیے اس کو اپنا کارساز)

یہ تہلیل (لا الہ الا ھو) سے مسبب ہے (یعنی لا الہ الا ھو سبب ہے اور "فاتخذہ و کیلا "مسبب ہے۔

سوال: لا الہ الا اللہ سبب ہے اور فاتخذہ وکیلا مسبب کیسے ہے؟

جواب: اولوہیت میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ تمام امور اسی کے سپرد کئے جائیں گے اللہ تعالیٰ کے سوا تمام اشیاء حادث ہیں تو یہ کیسے مناسب ہے کہ تمام امور حادث کے سپرد کیے جائیں اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہچان لے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں تو لامحالہ وہ تمام امور اسی کے سپرد کرے گا۔

﴿وَاصْبِرْ عَلٰى مَايَقُوْلُوْنَ﴾

(اور صبر کیجئے ان کی (دل آزار) باتوں پر)

جو دل شکن (دل آزار باتیں) (وہ کرتے ہیں)

﴿وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيْلًا﴾

اوران سے الگ ہو جایئے بڑی خوبصورتی سے) پہلوتہی کرنے کے ساتھ اور نرمی برتنے کے ساتھ اور ان سے بدلہ نہ لینے کے ساتھ اور ان کے معاملات کو اللہ تعالیٰ کے سپرد فرمادیں جیسے اللہ رب العزت نے فرمایا

﴿ وَذَرۡنِیۡ وَالۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴾

(آپ چھوڑ دیں مجھے اور ان جھٹلانے والے کو) آپ مجھے اور ان کو چھوڑ دیں اور کے معاملات کو میرے سپرد کردیں بے شک مجھ میں آپ کی جانب سے انہیں بدلہ لینے کی طاقت ہے۔

﴿ اُولِی النَّعۡمَۃِ ﴾ (مال داروں کو)

نعمتوں والے ہیں اوران سے مراد قریش کے سردار ہیں۔

﴿ وَمَهِّلۡهُمۡ قَلِیۡلًا ﴾ (اور انھیں تھوڑی سی مہلت دیں) تھوڑی سی مدت یا تھوڑی سی مہلت زمانا سے اس جانب اشارہ ہے کہ قلیلا سے پہلے زمانا موصوف محذوف ہے اور موصوف صفت ملکر مفعول فیہ بن جائے گا۔

امھالا سے اس جانب اشارہ ہے کہ قلیلا سے پہلے امھالا موصوف ہے اور موصوف صفت ملکر مفعول مطلق بن جائے گا۔

﴿ اِنَّ لَدَیۡنَاۤ اَنۡکَالًا ﴾

(ہمارے پاس ان کے لیے بھاری بیڑیاں)

یہ امر کے لئے تعلیل ہے (علت ہے) اس میں بلاغت کے قاعدہ فصل کی جانب اشارہ ہے کہ اس جملہ سے پہلے کوئی حرف عطف کیوں موجود نہیں ہے تو بتا رہے ہیں کہ اس جملہ اور پہلے جملہ کے درمیان کمال اتصال ہے اور دوسرا جملہ پہلے جملہ کی علت بیان کررہا ہے اور نکل، بھاری بیڑی کو کہتے ہیں۔

﴿ وَّجَحِیۡمًا وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ ﴾

(اور بھڑکتی آگ ہے اور غذا جو گلے میں پھنس جانے والی ہے) ایسا کھانا جو حلق میں اٹک جائے گا جیسے ضریع اور قوم۔

ضریع: یہ ایک کانٹے دار بوٹی ہے جو زمین سے چمٹی رہتی ہے اور جب یہ سرسبز ہو تو قریش اسے شرق کہتے ہیں اور جب خشک ہو جائے تو ضریع کہتے ہیں۔

زقوم: یہ دوزخ کا ایک درخت ہے، خادار، کڑوا، کسیلا ہے۔

﴿ وَّعَذَابًا اَلِیۡمًا ﴾

(اور دردناک عذاب)

عذاب کی ایک دوسری نوع قسم جو اذیت ناک ہوگی اور اس کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے اور عقوبات اربعہ، چار سزائیں انکال، جحیم، **طعام ذاغصہ** اور **عذاب الیم** یہ ایسی سزائیں ہیں جن میں اجسام اور ارواح دونوں مشترک ہیں۔

سوال: ان چاروں سزاؤں کا تعلق جسم کے ساتھ تو ہو سکتا ہے لیکن ارواح ان میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟

جواب: کیونکہ گنا کار نفوس جو شہوات میں منہمک رہتے ہیں وہ عالم مجردات کی طرف چھٹکارا پانے کے باوجود شہوات کی محبت میں اور ان کے ساتھ تعلق رکھنے میں مقید رہتے ہیں اور ان کی فرقت کی آگ میں جلتے رہتے ہیں اور ہجران (جدائی) کے غصے کو گھونٹ پیتے رہتے ہیں اور انوار اقدس کی تجلیات سے محروم ہونے کے ساتھ عذاب میں مبتلا رہتے ہیں (اور یہ تمام باتیں جسم اور ارواح دونوں پر صادق آتی ہیں) اسی وجہ سے عذاب کی تفسیر اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محرومی کے ساتھ کی گئی ہے (یعنی عذابا الیما سے مراد اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محرومی ہے)

انکال: ارواح کے لئے شہوات کی محبت میں گرفتار رہنا ہے۔

جحیم: ارواح کے لئے جدائی (فرقت) کی آگ میں جلنا ہے

طعاما ذا غصۃ: جدائی کے غصے کو گھونٹ گھونٹ پینا ہے۔

عذابا الیما : اللہ تعالیٰ سے ملاقات سے محرومی ہے۔

﴿ يَوۡمَ تَرۡجُفُ الۡاَرۡضُ وَالۡجِبَالُ﴾

((یہ اس) روز جس دن لرزنے لگیں گئے زمین اور پہاڑ) مضطرب ہو جائیں گے اور متزلزل ہو جائیں گے اور یوم اپنے مضاف الیہ کے ساتھ ملکران لدینا انکالا میں جو فعل کا معنی ہے (یعنی استقر) اس کے لئے ظرف بن رہا ہے۔

﴿وَكَانَتِ الۡجِبَالُ كَثِيۡبًا ﴾

(اور پہاڑ ریت کے بہتے ٹیلے بن جائیں گے)

ریت کا ڈھر بن جائیں گے گویا کہ فعیل بمعنی مفعول ہے اور یہ عربوں کا قول کثبت الشئی سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی شخص کسی چیز کو جمع کرے۔

﴿مَّهِيۡلًا﴾ (بہتے ہوئے)

بکھرے ہوئے یہ ھیلا نھیلا سے ماخوذ ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے کسی چیز کو بکھیر دیا جائے۔

چونکہ مھیلا، فعیل بمعنی مفعول ہے اس لئے امام بیضاوی نے کہا کہ ھِیۡلَ ھَیۡلًا سے مشق ہے یعنی فعل مجہول سے ماخوذ ہے۔

﴿ اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ ﴾ ((اے اہل مکہ!) ہم نے بھیجا ہے تمہاری طرف)

(کم ضمیر کا مرجع بتا رہے ہیں) اے اھل مکہ۔

﴿رَسُوۡلًا شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ ﴾ ((عظیم الشان) رسول تم پر گواہ بنا کر)

جو قیامت کے دن تم پر میری دعوت کو قبول کرنے اور اس کا انکار کرنے کی گواہی دے گا، (یعنی گواہی دے گا کہ کون اسلام لایا اور کسی نے کفر اختیار کیا)

﴿كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ﴾ (جیسے ہم نے فرعون کی طرف (موسیٰ کو) رسول بنا کر بھیجا)

رسول سے مراد حضرت موسی علیہ السلام ہیں۔

سوال: اگر رسول سے مراد حضرت موسی علیہ السلام ہیں تو پھر ان کا نام معین کیوں نہیں کیا؟

جواب: حضرت موسی علیہ السلام کو معین نہیں کیا کیونکہ مقصود ان سے متعلق نہیں ہے (یہاں مقصود اس شخص کا ذکر ہے جو رسولوں پر تکبر کرے اور اس بد بخت انجام مقصود ہے)

﴿ فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ ﴾ (پس نافرمانی کی فرعون نے رسول کی)

سوال: "کما ارسلنا الی فرعون رسولا " کی عبارت میں حضرت موسی علیہ السلام سے مقصود متعلق نہیں تھا اس لئے رسول کو نکرہ ذکر کیا لیکن یہاں معرفہ کیوں ذکر فرمایا؟

جواب: اس جگہ رسول کو معرفہ باللام ذکر فرمایا کیونکہ اس کا ذکر پہلے ایک بار گزر چکا ہے۔

اگر یہاں بھی نکرہ ہوتا تو وہم ہوسکتا تھا کہ اس رسول سے مراد حضرت موسی علیہ السلام کے علاوہ کوئی دوسرا رسول ہے۔

﴿فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلًا﴾ (تو ہم نے اس کو بڑی سختی سے پکڑلیا) بیلا کا معنی ثقیل ہے (یعنی بھاری) یہ عربوں کے قول طعام وبیل سے ماخوذ ہے یعنی ایسا کھانا جو بھاری پن کی وجہ سے جلد ہضم نہیں ہوتا اور اسی سے الوابل ماخوذ ہے جو زوردار موسلادار بارش کیلئے بولا جاتا ہے۔

﴿فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ﴾ ((ذرا سوچو) کہ تم کیسے بچو گے) اپنی جانوں کو کیسے بچاؤ گے؟

﴿ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ ﴾ (اگر تم کفر کرتے رہے)

کفر پر برقرار باقی رہے

﴿يَوْمًا﴾ (اس روز) اس دن کے عذاب سے (عذاب یوم سے اس جانب اشارہ ہے کہ یوما سے پہلے مضاف ''عذاب'' محذوف ہے۔

﴿يَّجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِيْبًا﴾ (جو بچوں کو بوڑھا بنادے گا)

اپنی ہولناکی کی شدت کی وجہ سے اور بطور فرض ہے (حقیقی طور پر نہیں کیونکہ قیامت کے دن کوئی بچے نہیں ہوں گے جو حقیقتا بوڑھے ہوجائیں گے مفہوم یہ ہے کہ اس روز ہولناکی اس قدر شد ہولناکی ہوگی کہ اگر وہاں کوئی بچہ ہوتا تو وہ بوڑھا دکھائی دیتا حالانکہ وہ بچہ ہی ہوتا یا یہ بطور تمثیل ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ غم قوتوں کو کمزور کردیتے ہیں اور بڑھاپے کو جلدی لاتے ہیں اور یہ بھی جائز ہے کہ دن کا یہ وصف اس کی طوالت کی وجہ سے ہو (یعنی جس طرح زندگی انسان کو بوڑھا کر دیتی ہے اسی طرح وہ دن اتنا طویل ہوگا کہ گویا بچوں کو بھی بوڑھا بنادے گا۔

﴿السَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ﴾ ((اور) آسمان پھٹ جائے گا) منفطر کا معنی منشق ہے یعنی پھٹ جائے گا۔

سوال: السماء مونث ہے اور اس کی خبر منفطر مذکر ہے حالانکہ مبتدا و خبر میں مطابقت ایک لازمی امر ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے؟

جواب: سقف کی تاویل پر خبر کو مذکر ذکر کیا (یعنی السماء کا ایک معنی السقف یعنی چھت بھی ہے اور السقف مذکر ہے تو سقف کی تاویل کی بناء پر خبر کو مذکر ذکر کیا)

یا اس سے پہلے شئی کا لفظ محذوف ہے (یعنی شئی مذکر ہے گویا کہ مبتدا اور خبر میں مطابقت پائی جارہی ہے)

﴿بِهٖ﴾ (اس (کے ہول) سے)

اس دن کی شدت سے آسمان پھٹ جائے گا اپنے عظیم اور محکم ہونے کے باوجود چہ جائیکہ کہ دوسری اشیاء اپنی حالت اصلی پر موجود رہیں اور ''ب'' آلہ کے لئے ہے (یعنی آسمان کے پھٹنے کا آلہ اور سبب اس دن کی ہولناکی اور شدت ہوگی)

﴿كَانَ وَعْدُهٗ مَفْعُوْلًا﴾ (اللہ کا وعدہ تو پورا ہو کر رہے گا)

''ہ'' ضمیر کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہے یا اس کا مرجع یوم کے لئے ہے اس بناء پر کہ مصدر کی اضافت مفعول کی جانب ہے۔

﴿اِنَّ هٰذِهٖ﴾ (یقیناً یہ (قرآن))

یہ دھمکی دینے والی آیات۔

﴿تَذْكِرَةٌ﴾ (نصیحت ہے) نصیحت (ہیں)۔

﴿فَمَنْ شَآءَ﴾ (پس اب جس کا جی چاہے)

شاء فعل متعدی ہے اور اس کا مفعول بہ اکثر محذوف ہوتا ہے ان یتعظ شاء کا مفعول واقع ہو رہا ہے کہ وہ نصیحت حاصل کرے۔

﴿اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (اختیار کرلے اپنے رب کی طرف سیدھا راستہ)

یعنی تقوی کے ساتھ اللہ کی جانب قریب وہ جائے یہاں سبب بول کر مسبب مراد ہے، اتخذ سبیلا، سبب ہے اور یتقرب الی ربہ مسبب ہے۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ﴾

(بے شک آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ (نماز میں) قیام کرتے ہیں کبھی دو تہائی رات کے قریب، کبھی نصف رات کبھی تہائی رات)

سوال: ادنی، دنا یدنو سے مشتق ہے جس کا معنی قریب ہونا تو یہاں معنی کیونکر درست ہوگا؟

جواب: یہاں معنی ادنی کا لفظ اقل کے لئے استعادۃ لیا گیا ہے کیونکہ جو چیز کسی دوسری چیز کے زیادہ قریب ہو وہ دوری کے لحاظ سے اس سے کم ہوتی ہے۔

اور ابن کثیر مکی اور کوفیوں نصفہ وثلثہ کو ادنی پر معطوف کرتے ہوئے نصب کے ساتھ پڑھا ہے (اس سے پتہ چلا کہ امام بیضاوی کی قرأت جر کے ساتھ ہے یعنی ان کے نزدیک نصفہ وثلثہ کا عطف ثلثی الیل پر ہے)

﴿وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ﴾ (اور ایک جماعت ان سے جو آپکے ساتھ ہیں وہ بھی (یونہی قیام کرتے ہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت بھی یونہی قیام کرتی ہے۔

﴿ وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ﴾

(اوراللہ تعالیٰ ہی چھوٹا بڑھا کرتا رہتا ہے رات اور دن کو)یعنی دن اوررات کی گھڑیوں کی مقداریں جس طرح ہیں ان کوصرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

سوال: امام بیضاوی نے حصر کا ترجمہ فرمایا یعنی کہ دن اور رات کی گھڑیوں کی مقداریں جس طرح ہیں ان کوصرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے جبکہ متن میں قصر کا کوئی قاعدہ موجودنہیں ہے تو پھر معنی کیسے درست ہوگا؟

جواب: لفظ اللہ کوایسے مبتدا کے طور پر مقدم کرنا جس پر یقدر کا فعل مبنی ہے اختصار کا شعور دلانے کے لیے ہے اورآنے والا ارشاداس کی تائید کررہا ہے

﴿ عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ ﴾ (وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے)

یعنی اگر تم ان اوقات ک مقداریں شمار نہیں کرسکتے اوران ساعات کوضبط کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔

﴿ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ﴾ (تواس نے تم پر مہربانی فرمائی)

مقررہ قیام اللیل کوترک کرنے میں رخصت دے کراس میں تاوان) کوتاہی کی صورت میں عذاب) کواٹھا کر (امام بیضاوی اس بات کی جانب اشارہ کررہے ہیں کہ یہاں تاب کا معنی تو بہ کرنا نہیں کیونکہ وہ یہاں غیر مناسب ہے بلکہ یہ رخصت دینے اور مؤاخذہ نہ کرنے سے مجاز ہے)

﴿ فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (پس تم اِتنا قرآن پڑھ لیا کروجتنا تم آسانی سے پڑھ سکتے ہو)پس تم اتنی رات کی نماز ادا کرلیا کروجتنی تم آسانی سے ادا کرسکتے ہو یہاں صلاۃ کوقرأت کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جس طرح نماز کواس کے باقی ارکان کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے(یعنی قرأت نماز کا رکن ہے جس طرح باقی ارکان ہیں اور یہاں مجاز مرسل کے قاعدہ کے مطابق جزء بول کرکل مراد ہے۔

کہا گیا ہے کہ مذکورہ اختیار کے ساتھ نماز تہجد واجب تھی پس ان پر قیام اللیل مشکل ہوگیا ہے تو اس اختیار کے ساتھ سابقہ اختیار منسوخ کردیا پھر اسے بھی پانچ نمازوں کے ساتھ منسوخ کردیا گیا۔

یا پھر قرأت قرآن سے بعینہ قرأت قرآن ہی ہے قرآن کریم کی تلاوت کروجتنی تم آسانی سے کرسکتے ہو۔

﴿ عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

(وہ یہ بھی جانتا ہے کہ تم میں سے کچھ بیمار ہوں گے اور کچھ سفر کرتے ہوں گئے زمین میں تلاش کررہے ہوں گے اللہ کے فضل (رزق حلال) کواور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہوں گے) یہ جملہ مستأنفہ ہے جوایک اور حکمت بیان کررہا ہے جورخصت اور تخفیف کا تقاضہ کرتی ہے اسی وجہ سے اس کے اوپر مرتب کرکہ حکم کومکرر ذکر فرمایا اور فرمایا

﴿ فَاقْرَءُوْا مَاتَيَسَّرَ مِنْهُ ﴾ (تو پڑھ لیا کروقرآن سے جتنا آسان ہو)

اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرتے ہوئے ضرب فی الارض سے مراد تجارت اور تحصیل علم کے لئے سفر کرنا ہے۔

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾

(اورنماز قائم کرو) جوفرض کی گئی ہیں۔

﴿ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ﴾

(اورزکوٰۃ ادا کرو) جوفرض کی گئی ہے(یہاں بھی زکوۃ سے مراد جوواجب زکوۃ ہے یہاں واجب فرض کے معنی میں ہے۔

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾

(اوراللہ کوقرضہ حسنہ دیتے رہا کرو)

اس سے مراد خیرات احسن طریقے سے زکوۃ کی ادائیگی مراد ہے اوراس میں بدلہ کے وعدہ کے ساتھ ترغیب دینا بھی مراد ہے(یعنی صدقہ کوقرض کا نام دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ اس مال کا بدلہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جہانوں میں لوٹا دے گا) جیسے کہ اس ارشاد میں اس کی تصریح فرمائی)

﴿ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَاللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّ اَعْظَمَ اَجْرًا ﴾
(اور جو نیکی تم آگے بھیجو گے اپنے لیے تو اسے اللہ کے پاس موجود پاؤ گے یہی بہتر ہے اور (اس کا) اجر بہت بڑھا ہوگا)

کہ آخرت کا اجر یا تو اس مال سے بہتر اور اعظم ہے جو تم موت کہ وقت وصیت کے لئے مؤخر کیے رکھتے ہو یا یہ دنیا کے سامان سے بہتر ہے اور دوسرا خیرا تجدوہ کا مفعول بہ ثانی ہے اور ھو ضمیر منفصل تجدوہ میں ''ہ'' ضمیر منصوب کی تاکید کے لئے ہے یا یہ ضمیر فصل ہے۔

سوال: یہ ضمیر فصل کیسے ہے جبکہ اس میں قاعدہ تو یہ ہے کہ دو معرفوں کے درمیان ہوتی ہے حالانکہ اس کے بعد خیر امعرفہ نہیں؟

جواب: جب اسم تفضیل کا صیغہ من کے ساتھ مذکور ہو تو وہ معرفہ کی طرح ہوتا ہے اور اسی وجہ سے اس پر الف لام تعریف لانا ممنوع ہوتا ہے اور اسے ''ھو خیر'' مبتدا اور خبر کی صورت میں بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ﴾
(اور مغفرت طلب کیا کرو اللہ سے)

تمام حالات احوال میں کیونکہ کوئی انسان کوتاہی سے خالی نہیں ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے)

سورۃ نمبر	سورہ المدثر	بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ	کل آیات

﴿يٰاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾

(اے چادر لپیٹنے والے!) المتدثر کی عبارت سے اس جانب اشارہ کیا جارہا ہے کہ المدثر باب تفعل سے اسم فاعل کا صیغہ ہے ت کو دال سے بدل کرت میں ادغام کیا۔

اب المدثر کا معنی بتارہے ہیں کہ چادر (دثار) لپیٹنے والا) یہاں دثار حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ مجازی معنی میں استعمال ہورہا ہے وہ نبوت اور نفسانی کمالات ہیں۔

دثار ایسی بڑی چادر کو کہتے ہیں جو سارے جسم کو ڈھانپ دے۔

روایت کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں (غار) حرا میں موجود تھا پس مجھے ندا (صدا) آواز دی گئی میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھا تو میں نے کچھ بھی نہ پایا پھر میں نے اپنے اوپر دیکھا کہ آسمان اور زمین کے درمیان تخت پر بیٹھا ہوا ہے یعنی وہ فرشتہ جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ندا دی پس میں مرعوب ہو گیا پھر میں نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف واپس لوٹا تو میں نے کہا کہ مجھے چادر (کمبل) اوڑھا دو پس جبرائیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا یا ایھا المدثر اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ یہ پہلی صورت ہے۔

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ قریش کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم غور وفکر کرتے ہوئے چادر اوڑھ کر آرام فرمارہے تھے تو تب یہ صورت نازل ہوئی (عربوں میں رواج تھا کہ اگر کسی شخص کو کسی حالت میں دیکھتے تو اسی سے خطاب کر لیتے اور وہ اس کی کنیت مشہور ہوجایا کرتی تھی)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ مدثر سے مراد وہ ذات ہے جو نبوت کمالات نفسانی کی چادر اوڑھنے والی ہے یا المدثر کا معنی خود کو چھپانے والا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے تو گویا آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود کو لوگوں سے چھپانے والے تھے اور اسے صورت میں المدثر کو مخفی کے لیے بطور استعارہ لیا گیا ہے اور اسے المدثر (یعنی باب تفعیل سے) بھی پڑھا گیا ہے یعنی اے وہ ہستی (ذات) جس نے اس امر کا احاطہ فرمایا اور اسے گھیر لیا۔

﴿قُمْ﴾

(اُٹھیے) اپنے بستر سے اٹھیں یا پختہ عزم وارادہ کے ساتھ کھڑے ہو جایئے (پہلے معنی کی صورت میں دثار کا حقیقی معنی مراد ہوگا اور دوسری صورت میں دثار سے مراد نبوت کی چادر ہوگی۔

﴿فَاَنْذِرْ﴾ ((اور لوگوں) ڈرایئے)

سوال: أَنْذِرْ فعل متعدی ہے جو فاعل کے ساتھ ساتھ مفعول بہ کو بھی چاہتا ہے یہاں اس کا مفعول کیوں ذکر کیا گیا؟

جواب: اس کے مندرجہ ذیل احتمالات ہیں۔

(۱) عمومیت کا فائدہ دینے کے لئے مطلق ہے۔(یعنی فعل متعدی کو لازم کے قائم کے قائم مقام کر دیا گیا ہے)

(۲) اس کا مفعول محذوف ہے یعنی جس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ''وانذر عشیرتك الاقربین'' دلالت کرتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ''وما ارسلنك الا كافة للناس بشرا و نذیرا'' دلالت کرتا ہے۔

نوٹ: پہلی آیت عام مفعول محذوف پر دلالت کر رہا ہے جبکہ دوسری آیت خاص مفعول محذوف پر دال ہے۔

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾

(اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کیجئے) اور اپنے رب کو تکبیر کے ساتھ خاص کیجئے

تکبیر کی تعریف:

تکبیر سے مراد عقدا (اعتقاد) اور قول کے لحاظ سے کبریائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا وصف کرنا ہے روایت کیا گیا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اللہ اکبر کی صدا بلند فرمائی) تکبیر کہی اور یقین کر لیا کہ یہ (کلام) وحی ہے۔

اور وحی کا یقین کرنا بایں وجہ تھا کہ شیطان تکبیر کا حکم نہیں دیتا۔

سوال: فکبر اور فطهر میں ف کونسی ہے؟

جواب: اس کے بارے میں مندرجہ ذیل احتمالات ہیں

(۱) اور اس جگہ پر (فکبر) میں ''ف'' اور اس کے بعد (فطهر) میں ''ف'' شرط کے معنی کا فائدہ دیتی ہے۔

یہ ف سببیہ نہیں ہے کیونکہ ف سببیہ کے بعد ایسے مسبب کا ہونا ضروری ہے جو اس کے ماقبل کو لازم ہو لیکن یہاں ایسی کوئی چیز نہیں جو اس پر مرتب ہو یعنی اس کے بعد کوئی مسبب نہیں جو اس کے ماقبل کو لازم ہو اس سے معلوم ہوا کہ یہاں ف شرطیہ ہے۔

سوال: آپ نے ف کو شرطیہ بنایا ہے تو پھر اس کی شرط کیا ہے؟

جواب: تقدیر کلام یوں ہے وما یکن ربک۔

ترجمہ: یعنی حالات جیسے بھی اپنے پروردگار کی برائی بیان کیجیے۔

(۱) یا اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ قیام حکم کا پہلا مقصود یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم شرک اور اس مشابہت سے اپنے رب کی پاکی بیان کیجیے (یعنی اس صورت میں ف عاطفہ ہوگی جو ترتیب مع التعقیب کے لیے آتی ہے۔

اور سب سے پہلی چیز جسے جاننا واجب ہے وہ صانع (کاریگر) (بنانے والا) پیدا کرنے والے کی معرفت کو جاننا ہے اور اس وجود کا علم ہو جانے کے بعد جو چیز واجب ہے وہ اللہ تعالیٰ کے عیب سے پاکی بیان کرنا ہے اور قوم اس کا اقرار کرتی تھی (یعنی کفار مکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک بھی ٹھہراتے ہیں اور دیگر اشیاء کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تشبیہ دیتے تھے۔

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾

(اور اپنے لباس کو پاک رکھیے) اپنے لباس کو تمام نجاسات سے پاک رکھیں نماز میں پاکیزہ کا حصول واجب جبکہ اس کے علاوہ میں پسندیدہ ہے طہارت

کا حصول دھونے سے ہے یا نجاست سے کپڑوں کی حفاظت کے ساتھ ہے کہ انہیں لپیٹ کر رکھا جائے اس خوف سے کہ دامن نجاست پر گھٹیا نہ رہے (اس تاویل کی صورت میں الثیاب اپنی حقیقی صورت معنی میں مستعمل ہے اور وہ یہ پہلا حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے مذموم عادات کو ترک کرنے کے بارے میں دیا گیا ہے۔

یا اس آیت سے مقصود یہ ہے کہ اپنے نفس کو اخلاق ذمیہ اور افعال دمیمہ سے پاک کیجیے؛

اخلاق ذمیمہ: ایسے اخلاق جن کی مذمت کی جائے۔

افعال دمیمہ: ایسے کام جن پر مذمت کی جائے۔

پس یہ قوت نظریہ کی تکمیل اور اس کی طرف دعوت دینے کے حکم کے بعد قوت عملیہ کی تکمیل کا حکم تھا۔

یعنی پہلے قم فانذر وربك فكبر میں قوت نظریہ کی تکمیل اور اس کی طرف دعوت دینے کا حکم دیا گیا ہے پھر ثيابك فطهر میں قوت عملیہ کی تکمیل کا حکم دیا گیا ہے (یا پھر اس کا معنی یہ ہوگا) نبوت کی چادر کو کینہ، اکتا جانے کا عمل اور قلت صبر جیسی اشیاء سے پاک رکھیے جو اسے گدلا کر دیتی ہے۔

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾

(اور بتوں سے (حسب سابق) دُور رہیے)

شرک اور دوسری قبیح خصلتیں جو کہ عذاب کی طرف لے جاتی ہیں ان کو ترک کرنے پر ثابت قدم رہتے ہوئے عذاب کو چھوڑ دیجیے۔

یعقوب حضر بصری اور امام حفص نے ضمہ کے ساتھ الرُجز پڑھا ہے اور یہ بھی ایک لغت ہے جیسا کہ ذُکر (ذِکر کو ذُکر)

پہلا معنی:

﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾

(اور کسی پر احسان نہ کیجئے زیادہ لینے کی نیت سے) کثیر کی طلب میں کسی کو عطاء نہ کیجیے (مستکثراً سے اس بات کی جانب اشارہ ہے کہ تستکثر فعل تمنن کی انت ضمیر سے حال واقع ہو رہا ہے۔

اور یہ استغز ار سے روکنا ہے اور استغز ار یہ ہے کہ آدمی زیادہ عوض کا طمع کرتے ہوئے کوئی چیز عطاء کرے (مثلاً کسی کو کسی موقع پر اس نیت سے مال دینا کہ کل یہ شخص کسی موقع پر زیادہ مال عطا کرے گا وغیرہ)

اور دلائل کے معارض آنے سے یہ نہی تنزیہ ہے (یعنی اگر خطاب ہر مخاطب کو ہوں تو یہ تنزیہ ہوگی یا یہ نہی حضور ﷺ کے ساتھ خاص ہے (یعنی آپ ﷺ کے لئے نہی تحریمی کے ساتھ خاص ہے) یعنی آپ ﷺ کے لئے نہی تحریمی جبکہ باقیوں کے لئے نہی تنزیہی ہے۔

سوال: یہ نہی حضور ﷺ کے لئے تحریمی اور دیگر لوگوں کے لئے تنزیہی کیسے ہو سکتی ہے؟

جواب: یہ حضور ﷺ کے فرمان زیادتی کی طلب کے ساتھ ھبہ کرنے والے لوگوں کو اس کے ھبہ کا بدلہ دیا جاتا ہے (مستغز ر کو اس کے ھبہ کا ثواب دیا جاتا ہے اس نہی کا موجب وہ ہے کہ جو اس میں حرص اور بخل پایا جاتا ہے۔

وضاحت:

یعنی استغز ار سے نہی حضور ﷺ کے لئے خاص اس لئے ہے یا اس کا سبب یہ ہے کہ ایسے ھبہ میں حرص اور بخل پایا جاتا ہے اور یہ صفات ذمیمہ میرے مصطفیٰ کریم ﷺ کے شایان شان نہیں۔

دوسرا معنی: یا اس آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اپنی عبادت کو زیادہ (کثیر گمان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پر احسان نہ کیجیے)

تیسرا معنی: یا معنی یہ ہوگا کہ لوگوں سے تبلیغ کا زیادہ اجر طلب کرتے ہوئے اس کے ساتھ لوگوں پر احسان نہ جتلائے۔

اور اسے وقف کی بناء پر تمنن کے بدل کی وجہ سے سکون کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے۔

بدل کی صورت میں یہ من بکذا سے ماخوذ ہوگا یا تستکثر کا معنی ہوگا تجدہ کثیرا یعنی آپ ﷺ اسے زیادہ پائیں گے اور اسے ان کے مضمر ہونے کی بناء پر نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اور اُن کو ظاہر کرنے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے اس بناء پر جائز ہے کہ اس کو ان کے حذف ہونے اور اس کے عمل کو باطل کرتے ہوئے رفع کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ احضر الوغی کی شاعر کے شعر میں رفع کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ (پڑھا گیا ہے)

خبردار اے مجھے اس بات پر جھڑکنے والے کہ میں جنگ میں حاضر ہوتا ہوں

اگر میں لذتوں کے پاس حاضر ہوں تو کیا تو مجھے دائمی زندگی کی ضمانت دے سکتی ہے

﴿وَلِرَبِّكَ﴾

(اور اپنے رب (کی رضا) کے لیے) اپنے رب کی خوشنودی یا اس کے امر کے لئے (صبر فرمائیں)

امام بیضاوی بتا رہے ہیں کہ ربک سے پہلے مضاف محذوف ہے۔

﴿فَاصْبِرْ﴾

(صبر کیجئے) صبر کو استعمال کیجیے یا مکلّف بنائے جانے والی مشقتوں اور مشرکین کی تکالیف پر صبر کیجیے۔

﴿فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ﴾

(پھر جب صور پھونکا جائے گا صور میں) امام بیضاوی **فی الصور** کے الفاظ سے **فی الناقور** کا معنی بیان کرر ہے ہیں یعنی ''صور میں'' اور **فاعول من النقر** بمعنی کی عبارت سے بتا رہے ہیں کہ **نا قور نقر** سے **فاعول** کے وزن پر مشتق ہے جو کہ آواز پیدا کرنے کے معنی میں ہے اور اس کی اصل ایسی کھٹکھٹاہٹ ہو جو آواز پیدا کرنے کا سبب ہوتی ہے اور فاء سببہ ہے (اذا سے پہلے فاء سببہ ہے اور اصبر امر کا جواب امر ہے) گویا کہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے کہ مشرکین کی تکالیف پر صبر فرمائیں۔

ان کے سامنے ایسا مشکل زمانہ جس میں آپ ﷺ اپنے صبر کا اجر پائیں گے اور آپ ﷺ کے دشمن اپنے نقصان کے انجام کو پائیں گے۔

"الضر" نقصان، بدحالی، جسمانی تکلیف۔

اور اذا اس فعل کے لئے ظرف ہے جس پر اللہ تعالٰی کا یہ ارشاد دلالت کر رہا ہے (یعنی **اذا نقر عسر** فعل کے لئے ظرف ہے جس پر آنے والا فرمان دلالت کرر ہا ہے۔

﴿فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾

(تو وہ دن بڑا سخت ہوگا کفار پر) اس کا معنی یہ ہوگا کہ کافروں پر معاملہ سخت (تنگ) ہوگا اور یہ صور پھونکنے کے وقت کی طرف اشارہ ہے (یعنی **ذالك** کی عبارت سے امام بیضاوی ترکیب کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں) **ذالك** مبتدا ہے جس کی خبر **یوم عسیر** ہے اور **یومئذ ذالك** سے بدل ہے یا اس کی خبر کیلئے ظرف ہے)

یعنی عسیر شبہ فعل کے لیے ظرف ہے کیونکہ تقدیر کلام یوں ہے

"فلذالك الوقت وقوع يوم يوم عسير "

﴿غَيْرُ يَسِيْرٍ﴾

(آسان نہیں ہوگا)

سوال: **غیر یسیر** کے الفاظ کلام میں کیا فائدہ دے رہے ہیں جبکہ اس دن کی سختی بیان کرنے کے لئے تو **عسیر** کا لفظ ہی کافی ہے پھر **غیر یسر** کے الفاظ بیان کرنے (لانے) میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب: **غیر یسر عسیر** کی تاکید ہے۔

سوال: ایک امر معاملہ کا من وجہ آسان ہونا اور من وجہ مشکل و بھاری بھی ہونا کیسے ممکن ہے؟

جواب: یہ تاکید اس بات کے مانع ہے کہ یہ معاملہ کفار پر ایک لحاظ سے مشکل (سخت) ہو اور دوسرے لحاظ سے سخت نہ ہو (بلکہ وہ دن ہر لحاظ سے کفار پر سخت ہوگا کیونکہ یسیر نکرہ اور نفی کے تحت واقع ہے اس لئے یہ تمام افراد کو عام ہے۔

اور یہ تاکید اس بات کا شعور دلاتی ہے کہ یہ معاملہ (دن) اھل ایمان پر آسان ہوگا (یعنی غیر یسیر تاکید کے ساتھ ساتھ تعریض بھی ہے کہ وہ دن مومنین پر آسان ہوگا۔

﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا﴾

(آپ چھوڑ دیجئے مجھے اور جس کو میں نے تنہا پیدا کیا ہے) یہ حکم (آیت) ولید بن مغیرہ کے بارے میں نازل ہوئی۔

سوال: وحیداً کس سے حال واقع ہو رہا ہے؟

جواب اول: وحیداً یائے متکلم سے حال واقع ہو رہا ہے یعنی مجھے اس حال میں چھوڑ دیجیے کہ میں اس کے ساتھ تنہا ہوں کیونکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس کے لئے کافی ہوں۔

(ذرنی کی یائے ضمیر متکلم ذوالحال اور وحیدا حال)

جواب ثانی: خلقت کی ت ضمیر سے حال ہے یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے چھوڑ دیجیے اور اس کو میں نے اکیلا پیدا کیا ہے اسکی تخلیق میں بھی میرے ساتھ کوئی شریک نہیں تھا (تُ ضمیر ذوالحال، وحیداً حال)

جواب ثالث: یہ ضمیر عائد جو کہ محذوف ہے اس سے حال واقع ہو رہا ہے کہ معنی یہ ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے چھوڑ دیجیے اور اس شخص کو جسے میں نے تنہا پیدا کیا کہ اس کے پاس نہ مال تھا اور نہ ہی اولاد عبارت یوں ہوگی ومن خلقتہ وحیدا کیونکہ جب ضمیر عائد مفعول بہ بن رہی ہو تو اس کو حذف کرنا جائز ہے (ہ ضمیر ذوالحال اور وحیداً حال)

جواب رابع: یہ حال نہیں بلکہ منصوب الی الذم ہے (یعنی اس سے پہلے ادم فعل محذوف ہے جس کا یہ مفعول بن رہا ہے۔

سوال: اس کی مذمت وحیدا کے ساتھ کرنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب اول: کیونکہ ولید بن مغیرہ وحید کے لقب سے ملقب تھا پس اللہ تعالیٰ نے تہکما اسے یہ نام دیا۔

تھکما: دھمکی دینا۔

جواب ثانی: اللہ تعالیٰ اسے اس ارادہ کی بناء پر وحید کا نام دیا کہ وہ اکیلا تو ہے لیکن صرف شرارت میں ہی (یعنی وہ شرارتوں میں یکتائے روزگار ہے اس جیسا شریر اور کوئی نہیں ہے۔

جواب ثالث: اللہ تعالیٰ نے وحیدا کا نام اس لئے دیا کیونکہ ولید بن مغیرہ اپنے باپ سے تنہا تھا کیونکہ بد اھل یعنی ولد زنا (حرامی) تھا۔

﴿وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا﴾

(اور دے دیا ہے اس کو مال کثیر) امام بیضاوی مالا ممدودا کا معنی بیان کر رہے ہیں کہ پھیلا ہوا کثیر مال یا وہ مال نشو نما کے ساتھ پھیلانے والی ہے مراد یہ ہے کہ اسے اپنے مال چلا رہا ہے۔

اور ولید بن مغیرہ کے پاس کھیتی مویشی اور اموال تجارت (سب کچھ) تھا۔

الزرع: کھیتی (بوئی ہوئی چیز) بیج، اولاد الضرع: تھن (مویشی مراد ہیں)

التجار: سوداگری، تجارت کا پیشہ کاروبار، سامان تجارت

﴿وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا﴾

(اور بیٹے دیے ہیں جو پاس رہنے والے ہیں) جو (ہر وقت) مکہ مکرمہ میں اس کے پاس حاضر رہتے تھے وہ ان کی ملاقات سے لطف اندوز ہوتا تھا اور وہ (بیٹے) طلب معاش کے لئے دور دراز کے سفر کرنے کے محتاج نہیں تھے کیونکہ وہ اپنے باپ کے مال و دولت کے ساتھ مستغنی ہیں اور کثرت خدام کی وجہ سے نہ ہی ولید بن مغیرہ انہیں کسی سے کسی بات پر مصالحت کے لئے بھیجنے کا محتاج ہے۔

مصالحۃ: کسی کے ساتھ صلح دامن کے ساتھ رہنا۔

اس ترجمہ کو کنفرم کرلیں

یاشھود کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی وجاہت و اعماد کی وجہ سے محافل و مجالس میں حاضر ہوتے ہیں۔

تمام کے تمام شرف وجاہت کے مالک ہیں اس لئے وہ مخاصمت وقضایا کی مجالس میں حاضر ہوتے ہیں اور لوگ ان کی باتوں اور فیصلوں کی پیروی کرتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ ولید بن مغیرہ کے دس یا اس سے زیادہ بیٹے تھے جو سارے کے سارے بہادر تھے ان میں سے تین خالد و عمارہ اور ہشام نے اسلام قبول کیا۔

﴿وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِيْدًا﴾

(اور مہیا کردیا ہے اسے ہر قسم کا سامان) اور میں نے اس کیلئے ریاست (سرداری) اور لمبی چوڑی عزت وجاہ کے اسباب فراہم کیے یہاں تک اسے ریحانہ قریش (قریش کا گل خنداں اور وحید کا لقب دیا گیا یعنی وہ اکیلا ریاست کا مستحق اور مجلس میں آگے ہونے کا مستحق۔

﴿ثُمَّ يَطْمَعُ اَنْ اَزِيْدَ﴾

(پھر طمع کرتا ہے کہ میں اسے مزید عطا کروں) جو میں نے عطا کیا ہے اس پر (زیادہ کروں) اور یہ اس کے طمع کے لئے استعباد ہے (یعنی اس کے لئے یہ بات مناسب نہیں کہ وہ یہ طمع کرے) یا اس لئے استعباد ہے کہ اس کے لئے اس سے زیادہ کچھ نہیں جو اسے دیا گیا ہے یا اس لئے استعباد ہے کہ وہ نعمتوں کی ناشکری اور نعمتیں عطا کرنے والے پروردگار سے سرکشی (دشمنی) کی جس حالت پر ہے اس کی بدولت اس کے لئے مناسب نہیں کہ اسے مزید عطا کیا جائے اسی وجہ سے اللہ نے ارشاد فرمایا۔

﴿كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا﴾

(ہرگز نہیں وہ ہماری آیتوں کا سخت دشمن ہے) کیونکہ یہ اس طمع (لالچ سے جھڑکا جا رہا ہے کہ اور منعم حقیقی (اللہ تعالیٰ) کی آیات نشانیوں سے دشمنی جو کہ نعمتوں کو زائل کردینے کے مناسب اور زیادہ عطا کرنے کے مانع ہے کے ساتھ استئناف (جملہ استنافیہ) کے طور پر جھڑکنے کی علت بیان کی جارہی ہے اور کہا گیا ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد وہ مسلسل حالت نقصان میں رہا یہاں تک کہ وہ ھلاک ہوگیا۔

﴿سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا﴾

(میں اسے مجبور کردوں گا کہ وہ کھٹن چڑھائی چڑھے) عنقریب میں اسے مشکل گھاٹی چڑھاؤں گا۔ (یعنی ایسی گھاٹی میں گرا دوں گا جس سے اوپر چڑھنے کا راستہ کھٹن ہوگا اور یہ ضرب المثل ہے اس شخص کے لئے جو مشکلات سے دوچار ہوتا ہے)

اور نبی کریم ﷺ سے روایت کیا گیا ہے کہ ''صعود'' آگ کا پہاڑ ہے جس پر ستر سال تک چڑھتا رہے گا پھر اس میں گزر جائے گا اسی طرح ہمیشہ ہوتا رہے گا۔

﴿اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ﴾

(اس نے غور کیا اور پھر ایک بات طے کرلی) یہ اس وعید کی علت بیان کر رہا ہے یا اس کی سرکشی کو بیان کر رہا ہے اور اس کا معنی یہ ہے کہ قرآن میں از روئے طعنہ زنی جو وہ خیال کرتا ہے اس میں اس نے غور وفکر کیا اور جو قرآن کے بارے میں کیا کرتا تھا اس کو اپنے نفس (دل) کے اندر محفوظ کرلیا۔

﴿فَقُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ﴾ (ضیاء القران کا ترجمہ لکھیں) یہ اس کے اندازے پر استھزاء کرتے ہوئے تعجب کیا جا رہا ہے یا پھر اس لئے کہا جا رہا ہے کہ قرآن مجید کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے ممکن تھا اس کی انتہاء کو پہنچ گیا اور یہ جملہ عربوں کے قول قتله الله ما اشجعه الله اسے غاوت کرے لہذا ابھاد رہے سے ماخوذ ہے یعنی فلاں شھادت کے اس مقام تک جا پہنچا جہاں وہ اس بات کا حق دار ہے کہ اس سے حسد کیا جائے اور اس کے حاسد اس کے خلاف بدعا کریں۔

اور روایت کیا گیا ہے کہ ولید بن مغیرہ نبی کریم ﷺ کے پاس سے گزرا در آنحالیکہ حضور ﷺ سورۃ حم السجدة تلاوت فرما رہے تھے پس وہ اپنی قوم کے پاس آیا اور کہا میں نے ابھی ابھی محمد ﷺ سے ایسا کلام سنا ہے جو جن وانس کے کلام سے نہیں ہے اس کلام میں بہت مٹھاس ہے اور اس میں بہت حسن ہے۔

اس کا اوپر والا حصہ پھل دار ہے اور نیچے والا حصہ گیرا مضبوط ہے اس کا غلبہ حاصل ہے اور اس پر غالب نہیں آ جا سکتا پس قریش نے کہا ولید صحابی ہو گیا اور اس کے چچا زاد بھائی ابو جہل نے کہا! تمہیں اس کے مقابلے میں کافی ہوں پس وہ غمگین حالت بنا کر اس کے پاس بیٹھ گیا پس وہ کھڑا ہو گیا اور قوم کے پاس آیا اور کہا گیا تم محمد ﷺ کو (نعوذ باللہ) مجنون گمان کرتے ہو کیا تم نے کبھی ان کو کسی کا گلہ دباتے ہوئے دیکھا ہے اور وہ کاہن ہیں کیا تم نے انہیں کہانت کرتے ہوئے دیکھا ہے اور تم گمان کرتے ہو کہ وہ شاعر ہیں کیا تم نے انہیں کوئی شعر کہتے ہوئے دیکھا ہے تو قوم نے کہا! نہیں۔

تو ولید بن مغیرہ نے کہا! وہ جادوگر ہی ہیں کیا تم نے دیکھا نہیں کہ وہ آدمی کو اس کے گھر والوں اس کی اولاد اور اس کے غلاموں سے جدا کر دیتے ہیں چنانچہ قریش اس کی اس بات پر بہت خوش ہوئے اور تعجب کرتے ہوئے منتشر ہو گئے۔

﴿ثُمَّ قُتِلَ كَيۡفَ قَدَّرَ﴾

(اس پر پھٹکار کیسی بری بات اس نے طے کی) کلام کو دوبارہ ذکر کرنا مبالغہ کے لئے ہے اور ثم اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ دوسرا جملہ پہلے جملہ سے زیادہ بلیغ ہے (یعنی ثم کا لفظ یہاں اپنے حقیقی معنی میں مستعمل نہیں ہوا بلکہ معنی مجازی میں تراخی مرتبہ کے لئے آیا ہے) اور آنے والی بعد کی آیت میں ثم کا لفظ اپنی اصل پر ہے (یعنی تراخی زمانہ کے لئے ہے)

﴿ثُمَّ نَظَرَ﴾

(پھر دیکھا،) یعنی قرآن کے معاملہ میں ایک بار غور کرنے کے بعد دوبارہ غور کیا۔

"قطب وجهه"

اس نے منہ بگاڑا وہ ترش رہ ہوا، ناک بھوں چڑھانا۔

﴿ثُمَّ عَبَسَ﴾

(منہ بسورا)

پہلا احتمال: اس نے اپنا منہ بگاڑا کیونکہ اس نے قرآن میں کوئی طعن والی بات نہ پائی اور وہ اس چیز کا ادراک نہ کر سکا کہ وہ کیسے۔

دوسرا احتمال: اس نے رسول اللہ ﷺ کی طرف دیکھا اور ترش روا ہوا۔

﴿وَبَسَرَ﴾

(اور ترش رُو ہوا) یہ فعل عبس کی اتباع میں استعمال ہوتا ہے یہ ہے کہ اس کی حالت میں بتدریج اضافہ ہوا پہلے تھوڑا منہ بسورا پھر درشتگی ظاہر کی اور پھر ناراضگی میں بڑھ گیا ہے۔

﴿ثُمَّ اَدۡبَرَ﴾

(پھر پیٹھ پھیری) حق سے یا رسول اللہ سے (پیٹھ پھر لی)۔

﴿وَاسْتَكْبَرَ﴾

(اور غرور کیا) اس کی اتباع سے یعنی حق یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سے۔

﴿فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ﴾

(پھر بولا یہ نہیں ہے مگر جادو جو پہلوں سے چلا آتا ہے) یعنی روایت ہوتا چلا آرہا ہے کہ اور سکھایا جاتا آرہا ہے کہ اور اس جملہ پر فاعاطفہ اس بات پر دلالت کرنے کے لئے ہے کہ جب یہ کلمہ اس کے دل میں کھٹکا تو کسی دیر اور غور وفکر کے بغیر اس کے ساتھ اس کا منہ کھل گیا۔

(کیونکہ فاعاطفہ ترتیب مع تعقیب کے لئے آتی ہے)

﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ﴾

(یہ نہیں ہے مگر انسان کا کلام) یہ پہلے جملہ کے لئے آتا تاکید کی طرح ہے کیونکہ اس کا پہلے جملے پر عطف کیا گیا (اس بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ ان دونوں جملوں کے درمیان کمال اتصال ہے)

﴿سَاُصْلِيْهِ سَقَرَ﴾

(عنقریب میں اسے جہنم میں جھونکوں گا) یہ سادھقه صعودا سے بدل واقع ہورہا ہے۔

﴿وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سَقَرُ﴾

(اور تو کیا سمجھے کہ جہنم کیا ہے؟)

سوال: اس جملہ میں استفہام کو ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے؟

جواب: سقر کی شان کو بڑھانے کے لئے (استفہام کو ذکر کیا گیا ہے)

اللہ تعالیٰ کا فرمان

﴿لَا تُبْقِيْ وَلَا تَذَرُ﴾

(نہ باقی رکھے اور نہ چھوڑے) اس کا بیان ہے۔

یعنی وما ادراك ما سقر مبین اور لا تذر بیان ہے۔

یا یہ جملہ سقر سے حال ہے۔

سوال: اگر اس جملہ کو بنایا جائے تو اس کا عامل کون ہوگا؟

جواب: اس کلام میں پایا جانے والا تعظیم کا معنی ہی عامل ہے۔

اور معنی یہ ہے کہ یہ سقر کسی چیز کو بھی باقی نہیں رکھے گی جسے اس میں پھینکا جائے گا اور یہ اسے نہیں چھوڑے گی یہاں تک اسے ہلاک کردے۔

﴿لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ﴾

(جھلسا دینے والی آدمی کی کھال کو) یہ جلد کے ظاہری حصہ کو سیاہ کردینے والی ہے یا انسانوں کو جھلسا دینے والی ہے۔

اور یہ اسے اختصاص کے طریقے پر نصب کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے (یعنی اس سے پہلے اخص فعل محذوف نکالیں گے)

﴿عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ﴾

(اس پر انیس فرشتے مقرر ہیں) عشر چونکہ عدد ہے اس لئے عشر کی تمیز کی جانب اشارہ فرمارہے ہیں اس کی تمیز کے بارے میں دو احتمال ہیں۔

(۱) ملکا: (فرشتے معنی ہوگا اس پر 19 فرشتے مقرر ہیں)

(۲) صنفاً: (من الملئکة یلون امرھا)

ملائکہ کی ایسی اقسام جو جہنم کے معاملات سرانجام دیتی ہیں۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے یہاں پر 19 کا عدد خاص ذکر فرمایا ہے اسی عدد کو خاص کرنے میں کیا حکمت عملی پوشیدہ ہے؟

جواب اول: اس عدد کو خاص کیا ہے کیونکہ نفوس بشریہ کے نظر و عمل (غور فکر اور عمل) میں خلل واقع ہونے کا سبب 12 قوت حیوانیہ اور سات قوت طبیعہ ہیں۔

یعنی انسان کے غور و فکر اور عمل میں خلل کا سبب 19 قوتیں ہیں جن سے 12 قوت حیوانیہ ہیں اور سات قوت طبیعہ ہیں۔

12 قوت حیوانیہ مندرجہ ذیل ہیں

قوت حیونیہ حواس خمسہ باطنہ	حواس خمسہ ظاهرہ
(۱)خیال	(۷)باصرہ
(۲)حس مشترک	(۸)شامہ
(۳) الواھمہ	(۹)سامعہ
(۴) الحافظہ	(۱۰)لامسہ
(۵) المتصرفہ	(۱۱)ذائقہ
(۶) قوت غضبیہ	(۱۲)قوت شھویہ

سات قوت طبعیہ مندرجہ ذیل ہیں

(۱) الغادیہ	(۵) الجاذبہ
(۲) الغامیہ	(۶) الھاضمہ
(۳) المولدہ	(۷) الماسکہ
(۴) الماسکہ	

نوٹ: 19 کے عدد کو خاص کرنے کی حکمتیں کیا ہیں مزید پیاس بجھانے کے لئے تفسیر نعیمی جلد نمبر 12 صفحہ نمبر 43 کا مطالعہ فرمائیں۔

جواب دوم: 19 کا عدد اس لئے خاص کیا جھنم کے سات طبقات ہیں اور ان سے چھ طبقات کفار کے لئے خاص ہیں ہر قسم کو عقیدہ اقرار و عمل کے ترک پر ایسی قسم کا عذاب دیا جائے گا جو اس کے مناسب ہوگا اور عذاب کی ہر نوع پر ایک فرشتہ یا ایک صنف فرشتوں کی ایک قسم مقرر ہے جو اس کی ذمہ دار ہوگی اور ایک طبقہ امت کے گناہگاروں کے لئے ہے جنہیں عمل کے ترک پر ایسی قسم کا عذاب دیا جائے گا جو اس کے مناسب ہوگا اور ایک فرشتہ یا فرشتوں کی ایک صنف اس کی ذمہ دار ہوگی

وضاحت ملاحظہ فرمائیں:

جہنم کے سات طبقات ہیں۔

(۱)طبقات کفار کے لئے جبکہ آیت امت مسلمہ گناہگاروں کے لئے ہے۔

(۲)6طبقات میں ہر طبقہ کے اندر تین قسم کا عذاب دیا جائے گا۔

(۱)عقیدہ (۲)اقرار (۳)عمل

یوں چھ طبقات میں 18 قسم کے عذاب بن گئے اور 19 واں عذاب کی قسم کے گناہگاروں کو دیا جائے گا چونکہ ہر عذاب کی قسم پر ایک فرشتہ یا ایک صنف فرشتہ مقرر

ہے اس لئے 19 کا عدد ذکر کیا۔

جواب سوم: 19 کا عدد خاص اس لئے ہے کہ کیونکہ (دن رات) کل گھڑیوں کی تعداد 24 ہے ان 24 میں سے 5 میں صرف ہوتی ہے باقی 19 بچتی ہیں جو ان کاموں میں صرف ہوتی ہے جن پر عذاب کی مختلف انواع کے ساتھ مواخذہ ہوگا انواع کے ذمہ دار زبانیہ میں (چونکہ 19 ساعات ہیں اس لئے 19 کا عدد ذکر کیا۔

اور **تسعة عشر** کو عین کے سکون کے ساتھ پے در پے حرکت کو ناپسند کرتے ہوئے **تسعة عشر** بھی پڑھا گیا ہے جیسا کہ اسم واحد ہے اور اسے **تسعة اعشر** بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں **اعشر عشر** کی جمع ہوگی جیسا کے یمین ہے اس کی جمع اعین آتی ہے یعنی ہر گروہ کے 9 نقیب ہوں گے یا پھر **اعشر عشر** کی جمع ہے پس اس صورت میں یہ 90 بن جائیں گے۔

﴿وَمَا جَعَلْنَآ اَصْحٰبَ النَّارِ اِلَّا مَلٰٓئِكَةً﴾

(اور ہم نے نہیں مقرر کیے آگ کے داروغے مگر فرشتے)

سوال: اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو ہی **اصحاب النار** بنایا اس کی کیا حکمت ہے؟

جواب اول: تا کہ معذبین (عذاب افراد) کی جنس مختلف ہوں پس وہ ان کے لئے نرم نہ ہوں اور نہ ہی وہ ان سے راحت طلب کریں۔

جواب ثانی: فرشتوں کو اصحاب نار بنایا کیونکہ ملائکہ از روئے سختی کے سب سے زیادہ قوی (طاقت) ور ہیں اور اللہ تعالیٰ کے لیے سب سے زیادہ غضبناک ہونے والے ہیں روایت کیا گیا ہے کہ ابو جہل نے جب تسعہ عشر (یعنی جہنم پر 19 فرشتے مقرر ہیں) سنا تو وہ قریش سے کہنے لگا کیا تم میں سے ہر دس آدمی بھی اس بات سے عاجز ہیں کہ ان میں سے ایک آدمی پر قابو پالیں اس پر یہ آیت نازل ہوئی

﴿وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾

(اور نہیں بنایا ہم نے ان کی تعداد کو مگر آزمائش ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا)

سوال: قاعدہ ہے کہ مستثنیٰ مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہوتا ہے جبکہ آیت میں مستثنیٰ منہ ''عدتھم'' ہے اور مستثنیٰ فتنۃ ہے جو اس کی جنس سے نہیں ہے تو آیت میں استثناء کا قاعدہ کیسے ہوگا؟

جواب: اصل میں یہاں مستثنیٰ فتنہ نہیں ہے بلکہ مستثنیٰ محذوف ہے اور وہ العدا ہے۔

تقدیر کلام یوں ہوگا

"وما جعلنا عدتهم الا العدا الذيں اقتضى فتنتهم "

ترجمہ یوں ہوگا: ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر ایسی تعداد جو ان کی آزمائش کا تقاضہ کرتی ہے اور وہ نہیں ہے پس مؤثر کے بدلے اثر کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے اس بات پر تسبیہ کرتے ہوئے کہ وہ ان سے جدا نہیں ہوتا

مؤثر کو اثر سے تعبیر کیا یعنی اثر ذکر کیا جو کہ فتنہ ہے اور مؤثر مراد لیا جو کہ تعداد ہے اس بناء پر کہ اثر مؤثر سے جدا نہیں ہوتا۔

سوال: 19 کا عدد کفار کے لئے فتنۃ (آزمائش) میں مبتلا ہونے کا سبب کیسے ہوگا؟

جواب: کیونکہ انہوں نے اس تعداد کو قلیل جانا اور اس سے استھزاء کیا اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات کو حقیقت سے بعید جانا کہ اس قلیل تعداد سے دونوں گروہوں الثقعین سے مراد جن وانس ہیں۔

ترجمہ یوں بھی درست ہوگا (اس قلیل تعداد سے جن وانس کی کثیر تعداد کو کیسے عذاب دیا جائے گا اور شاید کہ اس سے جعل بالقول مراد ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے ساتھ اس کی تعلیل درست ہو۔

وضاحت:

جعل کا اطلاق دو معنوں پر ہوتا ہے۔

(۱) چیز کو نفس امر کی کسی صفت کے ساتھ متصف قرار دینا۔

(۲) صفت کے ساتھ اس چیز کے متصف ہونے کی خبر دینا۔

دوسرے معنیٰ کو **جعل بالقول** کہا جاتا ہے اور امام بیضاوی کہتے ہیں کہ یہاں **جعل بالقول** کا معنی مراد ہے یعنی اللہ تعالیٰ خبر دے رہا ہے کہ فرشتوں کی یہ تعداد اس صفت کے ساتھ متصف ہے کہ وہ کفار کے لئے آزمائش ہے۔

﴿لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ﴾

(تاکہ یقین کرلیں اہل کتاب) یعنی تاکہ اہل کتاب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید صداقت پر یقین کرلیں جب وہ دیکھیں کہ یہ تعداد اس تعداد کے موافق جو ان کی کتاب میں مذکور ہے۔

﴿وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا ﴾

(اور بڑھ جائے اہل ایمان کا ایمان) اس تعداد پر ایمان لانے کے ساتھ (اہل ایمان کا ایمان بڑھ جائے یا اھل کتاب کی تصدیق کے ساتھ (یعنی ان کا ایمان کیفیت کے اعتبار سے بڑھ جائے۔

﴿وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ﴾

(اور نہ شک میں مبتلا ہوں اہل کتاب اور مومن) یعنی اس تعداد کے بارے میں یہ حصول یقین اور زیادتی ایمان کی تاکید ہے یا اس شک کی نفی ہے جو یقین کرنے والے کو اس وقت عارض (لاحق) حاصل ہوتا ہے جب اس پر (کسی دلیل سے غفلت کی بناء پر) کوئی شبہ طاری ہو۔

﴿وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ﴾

(اور تاکہ کہنے لگیں جن کے دلوں میں روگ ہے)

سوال: مرض کا معنی منافقت (نفاق) کرنا کسی طرح درست ہوگا جبکہ یہ سورۃ مکی ہے اور مکہ میں تو منافقت نہیں پائی جاتی تھی؟

جواب: منافقت کی صورت میں اس آیت سے مکہ اس چیز کی خبر دینا ہے جو ہجرت کے بعد مدینہ میں رونما ہوگی۔

﴿وَّالْكٰفِرُوْنَ﴾

(اور کفار کیا) جھٹلانے میں قائم رہنے والے ہیں۔

﴿ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ﴾

(ارادہ کیا ہے اللہ نے اس بیان سے) اللہ تعالیٰ نے **ضرب المثل** کی اجنبیت کی طرح اس اجنبی عدد سے کس چیز کا ارادا کیا ہے (یعنی جس طرح **ضرب المثل** میں اجنبیت وغرابیت ہوتی ہے اسی طرح انہیں کے عدد میں بھی غرابت ہے)

اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب انہوں نے اس عدد کو بعید (از حقیقت) جانا تو گمان کیا یہ **ضرب المثل** بیان کی گئی ہے جب کفار نے اس عدد کو بعید از مکان اور عجیب وغریب سمجھا تو انہوں نے خیال کیا کہ اس عدد سے اللہ تعالیٰ کی مراد معنی نہیں جو عام مشہور ہے یعنی انہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس عدد کو کسی دوسری چیز کے لئے بطور مثال اور کسی کہ ضرب المثال میں ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اسے عام معنی میں مثال کے طور پر سنا اور **ضرب المثل** خیال کیا۔

﴿ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾

(یونہی اللہ تعالیٰ (ایک ہی بات سے) گمراہ کردیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور ہدایت بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے) ذکر کی گئی ہدایت وگمراہی کی طرح اللہ تعالیٰ کافرین کو گمراہ کرتا ہے اور مؤمنین کو ہدایت دیتا ہے

﴿وَمَا يَعۡلَمُ جُنُوۡدَ رَبِّكَ﴾

(اور کوئی نہیں جانتا آپ کے رب کے لشکروں کو) (یعنی اس کی مخلوق کے لشکروں کو) (کوئی نہیں جانتا) جس حالت پر وہ موجود ہیں۔

﴿اِلَّا هُوَ﴾

(بغیر اس کے) کیونکہ کسی کے لئے کوئی بھی راستہ نہیں کہ ممکنات کو شمار کر سکے اور ان ممکنات کے حقائق وصفات پر مطلع ہو سکے اور (یہ جان سکے) کہ وہ کونسا سبب ہے جو ان سے ہر ایک کے لئے اختصاص کو واجب کرتا ہے اس چیز کے ساتھ مقدار کیفیت یا نسبت کی وجہ سے خاص ہے۔کم سے مراد تعداد ہے جیسے داروغوں کا انیس ہونا کیف سے مراد کیفیت ہے جیسے حرارت و برودت اور نفع ونقصان کے لحاظ سے اشیاء کی طبائع اور اعتبار کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس سے مراد صفات عدمیت پس اور نسبت سے مراد صفات نسبی ہیں) (حاشیہ شہاب)

﴿وَمَا هِيَ﴾

(اور نہیں ہے یہ بیان) ھی ضمیر کے مرجع کے بارے میں تین احتمالات ہیں۔

(۱)سقر (۲)درغوں کی تعداد (۳)سورت

ترجمہ ہوگا اور نہیں ہے یہ جہنم یا یہ درغوں کی تعداد یا یہ سورت۔

﴿اِلَّا ذِكۡرٰى لِلۡبَشَرِ﴾

(مگر نصیحت لوگوں کے لیے) ان کے لئے پند ونصیحت

﴿كَلَّا﴾

(ہاں ہاں!) یہ اس شخص کو جھڑکنا ہے جس نے اس کا انکار کیا یا اس بات کا انکار کیا جا رہا ہے کہ وہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

﴿وَالۡقَمَرِ وَالَّيۡلِ اِذۡ اَدۡبَرَ﴾

(چاند کی قسم اور رات کی قسم جب وہ پیٹھ پھیرنے لگیں) یعنی ادبر جیسا کہ قبل از قبل کے معنی میں ہے۔

ای ادبر سے اس جانب اشارہ ہے کہ شاید امام بیضاوی کی قرأت ''دبر'' ہے جس کی وجہ سے انہوں نے ادبر فعل نکالا ہے۔

اور امام نافع مدنی، حمزہ کوفی، یعقوب حضر بصری اور امام حفص نے ماضی کی بناء پر اذ ادبر پڑھا ہے۔

جیسا کہ ہماری قرأت بھی یہی ہے اور اذ زمانہ ماضی کے لئے آتا ہے۔

﴿وَالصُّبۡحِ اِذَاۤ اَسۡفَرَ﴾

(اور صبح کی قسم جب روشن ہو جائے) یعنی جب وہ روشن ہو جائے۔(امام صاحب ای اَضاء سے اسفر کا معنی بتا رہے ہیں)

انہا أضاء سے اسفر کا معنی بتا رہے ہیں۔

﴿اِنَّهَا لَاِحۡدَى الۡكُبَرِ﴾

(یقیناً دوزخ بڑی آفتوں میں سے ایک آفت ہے) یعنی یقیناً دوزخ بڑی بلاؤں سے ایک ہے۔

سوال: یہاں کبری کی جمع کبر لائی گئی حالانکہ آپ بخوبی اس بات سے آگاہ ہیں کبری فعلیٰ کے وزن پر ہے اور فعلی کی جمع فعالی کے وزن پر آتی ہے اس اعتبار سے کبری کی جمع کباری ہونی چاہیے تھی اس میں کیا حکمت کارفرما ہے؟

جواب: کبری کی جمع کبر الف کو تاء کے قائم مقام کرتے ہوئے اسے فعلة کے وزن کے ساتھ ملا کر لائی گئی ہے (یعنی کبری کبرۃ کے قائم مقام ہے اور کبرۃ کی جمع کبر آتی ہے) جیسا کہ قاصعاکو قاصعة کے ساتھ ملحق کیا تو اس کی جمع قواصع بنائی گئی ہے۔

سوال: ترکیب کلام میں اس جملہ کا کیا محل ہے؟

جواب اول: یہ جملہ جواب قسم ہے۔

جواب ثانی: یہ جملہ کلا کی تعلیل ہے۔

سوال: درمیان کلام میں جملہ قیمہ معترضہ نے کا کیا فائدہ ہے؟

جواب: درمیان میں قسم بطور معترضہ تاکید کے لئے (ذکر کیا گیا ہے)

﴿نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ﴾

(ڈراوا ہے لوگوں کے لیے)

سوال: نذیرا للبشر کا ترکیبی محل کیا ہے؟

جواب: اس کے بارے میں چار احتمال ہیں۔

(۱) تمیز ہے (نسبت سے تمیز) ہے اس صورت میں معنی ہوگا کہ جہنم لوگوں کو ڈرانے کے طور پر بڑی آفتوں سے ایک آفت ہے۔

(۲) اس فعل سے حال ہے جس پر جملہ یعنی کبرت منذرۃ دلالت کرتا ہے (ترجمہ یہ ہوگا کہ دوزخ لوگوں کو ڈراتے ہوئے بڑی آفتوں سے ایک آفت ہے)

(۳) اسے رفع کے ساتھ نذیر للبشر بھی پڑھا گیا ہے اس صورت میں یہ اس کی خبر ثانی ہوگی۔

(۴) یا مبتدا محذوف کی خبر ہوگی (جو کہ ھو ہے)

﴿لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ﴾

(ان کے لیے جو تم میں سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں یا پیچھے رہنے چاہتے ہیں) اس کی ترکیب کے بارے میں دو احتمال ہیں۔

(۱) یہ بشر سے بدل ہے معنی ہوگا جھنم ڈراوہ ہے ان لوگوں کے لئے جنہیں بھلائی کی طرف سبقت لے جانے اور اس سے پیچھے رہ جانے کی قدرت دی گئی ہے۔

(۲) لمن شاء "ان یتقدم" کی خبر ہے۔

"پس یہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "فمن شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر" کے معنی میں ہوگا۔

﴿كُلُّ نَفْسٍ م بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ﴾

(ہر نفس اپنے عملوں میں گروی ہے) یعنی ہر نفس اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنے عملوں میں گروی ہے (مصدر) یعنی رھینہ مصدر ہے جیسا کہ شتیمه (فعیلة) کے وزن پر (رھینه کو) مفعول کے لئے لایا گیا ہے (یعنی مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے) جیسا کہ الرھن مصدر ہے (اور اسم مفعول مرھون کے معنی میں ہے) اگر رھینہ صفت کا صیغہ ہوتو رھین کہا جاتا ہے کیونکہ جب فعیل بمعنی مفعول ہوتو اس میں مذکر و مؤنث برابر ہوتے ہیں۔

﴿اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ﴾

(سوائے اصحاب یمین کے)

پس انہوں نے جو نیک اعمال کیے ان کی بدولت وہ اپنی گردنیں آزاد کر رلیں اور کہا گیا ہے کہ وہ فرشتے یا بچے ہیں۔

﴿فِيْ جَنّٰتٍ﴾

(جو جنتوں میں ہوں گے) ایسی جنتوں میں جن کے وصف کو کوئی نہیں جان سکتا (جن کے وصف کا کائی ادراک نہیں کرسکتا اور یہ جملہ اصحاب الیمین سے حال ہے یا آنے والے فرمان ان کی ضمیر سے حال ہے۔

﴿يَتَسَآءَلُوْنَ عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾

(اہل جنت پوچھیں گے مجرموں سے) بعض بعضوں سے مجرمین کے متعلق سوال کریں گے۔ (آپس میں ایک دوسرے سے)

یا اھل جنت اپنے غیر سے مجرموں کے حال کے بارے میں دریافت کریں گے۔

سوال: آپ نے دوسرا معنی کیسے اخذ کرلیا؟

جواب: کیونکہ مزید فیہ کبھی مجرد کے معنی میں بھی آتا ہے یتسائلون اگر چہ باب تفاعل سے جس کا خاصہ اشتراک ہے لیکن یہاں یہ اس کا خاصہ موافقت مجرد ہے۔ پس یتسائلون بمعنی یتسائلون ہے جیسا کہ آپ کا کہنا ہے تواعیناہ جو کہ دعوناہ کے معنی میں ہے اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان

﴿ مَاسَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ﴾

(کہ کس جرم نے تم کو دوزخ میں داخل کیا) اس کے جواب میں ہے جو اس کی حکایت کے طور پر لایا گیا ہے جو مسؤلون و مجرمین کے درمیان جاری ہوگا تو وہ جواب دیں گے۔

﴿قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ﴾

(وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے) یعنی فرض نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔

﴿وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ﴾

(اور مسکین کو کھانا بھی نہیں کھلایا کرتے تھے) جو ان کو عطا کرنا واجب ہے (وہ چیز نہیں دیا کرتے تھے) اس آیت میں دلیل ہے کہ کفار فروع یعنی ایمان کے علاوہ اعمال کے بھی مخاطب ہیں۔

﴿وَكُنَّا نَخُوْضُ مَعَ الْخَآئِضِيْنَ﴾

(اور ہم ہرزہ سرائی میں لگے رہتے) یعنی ہم باطل میں ہرزہ سرائی کرنے والوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے۔ (ہم باطل میں گھسنے والوں کے ساتھ گھسے رہتے تھے)

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾

(اور ہم جھٹلایا کرتے تھے روزِ جزا کو) مجرموں کے جہنم میں داخل ہونے کا سبب بننے والے چار امور میں سے روز جزا کی) تکذیب کو مؤخر کر کیا تا کہ اس گناہ کی بڑائی کا اظہار ہو یعنی ہم ان تمام جرائم کے بعد قیامت کو بھی جھٹلایا کرتے تھے۔

﴿حَتّٰى اَتٰنَا الْيَقِيْنُ﴾

(یہاں تک کہ ہمیں موت نے آلیا) یقین سے مراد موت اور اس کی شروعات ہیں۔

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ﴾

(پس انہیں کوئی فائدہ نہ پہنچائے گی شفاعت کرنیوالوں کی شفاعت) اگر وہ تمام کے تمام بھی ان کی شفاعت کریں۔

﴿فَمَا لَهُمْ عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ﴾

(پس انہیں کیا ہوگیا ہے وہ اس نصیحت سے روگرداں ہیں)

تذکرہ بمعنی تذکیرہ ہے مراد دیا تو خاص تذکیر ہے جو کہ قرآن مجید ہے) یعنی انہیں وہ گیا ہے کہ وہ قرآن سے روگردان ہیں (جو کہ سراپا نصیحت ہے) یا تذکیر سے مراد عام تذکیر ہے جو قرآن مجید کو بھی شامل ہے۔

﴿كَاَنَّهُمْ حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ فَرَّتْ مِنْ قَسْوَرَةٍ﴾

(گویا وہ بھڑکے ہوئے جنگلی گدھے ہیں جو بھاگے جا رہے ہیں شیر سے) اللہ تعالیٰ نے مجرمین کو نصیحت شئی سے ان کے اعراض ونفرت میں بھڑکے (بدکھے) ہوئے گدھوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو قسورہ یعنی شیر سے بھاگے جا رہے ہیں۔

وضاحت

اس تشبیہ کے مندرجہ ذیل ارکان ہیں۔

(۱) مجرمین مشبہ بہ

(۲) بھڑکے ہوئے گدھے مشبہ

(۳) نصیحت سے ان کا اعراض ونفرت وجہ شبہ

وضاحت

حضرت مفسر نافرہ کے کلمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کرر ہے ہیں کہ مستنفرہ اسم فاعل کا صیغہ ہے کیونکہ نفر اور استنفر دونوں ایک ہی معنی میں ہیں اور استنفر نفر سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ الفاظ کی کثرت معانی کی کثرت پر دلالت کرتی ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا قسورۃ حبشہ کی لغت میں شیر کو کہتے ہیں شیر کو قسورۃ اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ وہ درندوں پر غالب آجاتا ہے اور ان پر قہر برستا ہے۔ (حاشیہ شیخ زادہ)

ترجمہ: اور قسورۃ القسر سے فعولۃ کے وزن پر ماخوذ ہے اور قسر کا معنی قہر ہے اور امام نافع مدنی اور ابن عامر شامی نے ف کے فتح کے ساتھ مستنفرۃ پڑھا ہے۔

﴿بَلۡ یُرِیۡدُ کُلُّ امۡرِیٴٍ مِّنۡهُمۡ اَنۡ یُّؤۡتٰی صُحُفًا مُّنَشَّرَۃً﴾

(بلکہ ان میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ ان کو کھلے ہوئے صحیفے دیے جائیں) ایسے کاغذ جو پھیلے ہوئے ہوں (کھلے ہوں) اور پڑھیں جائیں اور یہ معاملہ یوں ہے کہ کفار نے نبی کریم ﷺ سے کہا کہ ہم ہرگز آپ ﷺ کی پیروی نہیں کریں گے یہاں تک کہ آپ ﷺ ہم میں سے ہر ایک کے پاس آسمان سے ایک کتاب لے کر آئیں جس میں یہ لکھا گیا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے فلاں کی طرف ہے کہ محمد ﷺ کی اتباع کرو۔

﴿کَلَّا﴾

(ایسا ہرگز نہیں ہوگا) یہ ان کو آیات کو ایسے معانی پہنانے سے جھڑکنا ہے جو کسی سے نہیں سے جاتے۔

اقتراح الامر: کسی سے معلوم کیے بغیر اپنے ذہن سے کوئی بات نکالنا ایجاد کرنا۔

﴿بَلۡ لَّا یَخَافُوۡنَ الۡاٰخِرَۃَ﴾

(دراصل وہ آخرت سے ڈرتے ہی نہیں) پس اس وجہ سے انہوں نے نصیحت سے اعراض کیا نہ کہ اس بات سے کہ صحیفے لانا ممنوع ہیں (یہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اعراض کے سبب کی وضاحت فرمائی ہے۔

﴿کَلَّا﴾

(ہاں ہاں) یہ انہیں ان کے اعراض کے بارے میں جھڑکا جا رہا ہے۔

﴿اِنَّہٗ تَذۡکِرَۃٌ﴾

(یہ قرآن تو نصیحت ہے) یعنی نصیحت حاصل کرتے۔

﴿فَمَنۡ شَآءَ﴾

(پس جس کا جی چاہے) (کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں)

﴿ذَکَرَہٗ﴾

(نصیحت حاصل کرے)

﴿وَمَا یَذۡکُرُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ یَّشَآءَ اللّٰہُ﴾

(اور وہ نصیحت قبول نہیں کریں گے بجز اس کے کہ اللہ تعالیٰ چاہے) یشاء فعل متعدی ہے جس کا مفعول اکثر محذوف ہوتا ہے امام بیضاوی اس کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں کہ اللہ ان کی نصیحت چاہیے یا نہ چاہیے یا ان کی چاہت کو چاہیے۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَمَا تَشَا ؤنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ

یہ ارشاد اس بات کی تصریح ہے کہ بندہ کا فعل اللہ تعالیٰ کی مثبت پر منحصر ہے اور امام نافع مدنی نے ت کے ساتھ تذکرون پڑھا ہے اور اسے تاء و یاء دونوں کے ساتھ مشدد بھی پڑھا گیا ہے۔

﴿ هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى ﴾ (وہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے) وہی اس قابل ہے کہ اس سے ڈرا جائے۔

﴿وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ﴾ (وہی بخشنے کے لائق ہے)وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اپنے بندوں کی بخشش فرمائے خصوصاً ان سے پرہیز گاروں کی۔"اللهم اغفرلنا واجعل حياتنا هدى للناس"